حبیب بینک اتنی ترقی کر سکتے تھے۔ یہ ان کی پیدا کردہ مسابقت ہی کا نتیجہ تھا کہ اتنا کچھ ہوگیا۔ گویا آغا حسن عابدی ایک ہمالیائی بلندی کی شخصیت تھے۔ یہ انھیں کی انتھک کوشش تھی جس کی وجہ سے BCCI ایسی بلندیوں کو چھو سکا تھا۔ دراصل اس ادارے کے ڈھانچے میں ہی خرابیاں تھیں۔ یہ خرابیاں ان کی پیدا کردہ تھیں یا ان کے نائبین میں سے کچھ لوگ ذمے دار تھے، مجھے اس کا علم نہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ اس ادارے کے کس کارکن میں یہ ہمت تھی کہ وہ کھڑا ہو کر یہ کہہ سکتا کہ جناب اس کام کو اس طرح نہیں، مختلف انداز میں کرنا چاہیے، یہ اک خرابی پیدا ہو چکی ہے اور اس کو درست کیا جانا چاہیے۔ اور میں ان لوگوں کو اسی طرح قصوروار سمجھتا ہوں جس طرح کوئی عابدی صاحب کو موردِ الزام ٹھہرائے۔ میں ایک آدمی کو جانتا ہوں جس نے اعتراض کیا تھا۔ اس کو نوکری سے نکالا نہیں گیا۔ بس ایک کنارے لگا دیا گیا تھا۔ انھوں نے کبھی کسی کو ملازمت سے برطرف نہیں کیا، صرف کنارے لگا کر خاموش کرا دیا۔ یہ تو اور بھی بُری بات تھی۔ اس طرح لوگوں کے دماغ غلط راہوں پر لگ گئے، کچھ ایسا ہی انشورنس کاروبار میں بھی ہوا اور ہم بھی غلط رہے۔ ہم سب کو اس بات کا پورا اندازہ ہی نہیں ہو سکا تھا کہ مالیات کا میدان بین الاقوامی تناظر میں اس سے کہیں مختلف تھا جیسا کہ ہمیں پاکستان میں نظر آتا تھا۔"

زندگی صرف کھلتے ہوئے گلاب اور بوگن ویلیا جیسی نہیں ہوتی۔ مجھے اور شرافت کو اپنے مشترک ماضی میں جھانکنے اور اپنے ضمیر کھنگالنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچنے میں کوئی دقت نہیں پیش آئی۔

'عابدی سلطنت' کے زوال کے بعد شرافت نے اپنا زندگی بھر کا پیشہ ترک کر دیا اور اپنا کاروبار شروع کر دیا۔ پہلے لندن میں اور اب دبئی میں۔ اپنے بہت سے ہم عمر لوگوں کی طرح وہ بھی اب دبئی میں مقیم ہیں اور دبئی کے کچھ شراکت داروں کی معاونت سے لباس تیار کرنے کا ایک کارخانہ چلا رہے ہیں۔ آج بھی خوب صورت بیوی سلطانہ کے ساتھ ایک پُرسکون زندگی گزار رہے ہیں۔ انھیں یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ موجودہ امیگریشن کے قوانین کے مطابق اپنے زندگی کے اس باب کو بھی بند کرنا ہوگا اور کسی اور سرزمیں پر نیا گھر بسانا ہوگا۔ والا جاہی آج بھی سماجی زندگی کی گھما گھمی کو پسند کرتے ہیں اور شرافت کے ساتھ سلطانہ بھی ان میں متحرک رہتی ہیں۔ اپنی خوشحال ازدواجی زندگی میں دونوں نے ایک دوسرے کی کمی کو بڑی خوبی سے دور کیا ہے۔ انھیں اس بات کے مواقع بھی ملے تھے کہ وہ اپنے شوہر سے ان ہی کے میدان میں مسابقت کرتیں اس طرح کہ وہ چارٹرڈ انشورنس انسٹی ٹیوٹ کی ایسوسی ایٹ شپ حاصل کرنے والی دوسری خاتون ہیں۔ ان کی اپنی شخصیت بھی مسحور کن ہے اور ان کی تنظیمی صلاحیتیں اکثر ان کے شوہر کی پیشہ ورانہ زندگی میں کام بھی آئیں تھیں۔

ای ایف یو کے ماضی کے بارے میں اس کتاب کی تدوین کی خود اختیار کردہ ذمے داری میں بھی شرافت نے میری بہت مدد کی ہے۔ اور ہم نے مل کر بہت سے ایسے امور دریافت کیے ہیں جو شاید کبھی ظاہر نہ ہو سکتے، اور تلف ہو جاتے۔ میں اور میری اہلیہ دونوں اس مسحور کر دینے والے جوڑے سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ ہم نے نہ صرف ماضی کی باتیں کیں بلکہ پاکستان کے حال اور اس کے ممکنہ مستقبل کے بارے میں خیال آرائیاں کیں۔ انھیں کے ساتھ، کے ایف حیدر کے بیٹے اور اپنے پرانے دوست سجاد حیدر سے بھی ملے جو اس ابلتے ہوئے شہر میں کامیاب کاروباری زندگی گزار رہے ہیں۔ اور ہم، اپنے پیارے دوست ماموں سجالی کے چھوٹے بھائی حمید سجالی سے بھی ملے، جو کچھ برس آدمجی انشورنس کے نوجوان افسر رہے تھے۔ حمید کچھ برس ہوئے اٹلی کی انشورنس کمپنی Assecurazione Generali سے ریٹائر ہو کر پاکستان واپس آگئے ہیں اور ای ایف یو کے ایڈوائزر ہو گئے ہیں۔

میں یہاں شرافت کے ان دو دوستوں کا تذکرہ کر رہا ہوں اس لیے کہ یہ دونوں اس بڑے نقصان کی علامت ہیں جو پاکستان میں بیمے کی صنعت ان کی غیر موجودگی کی بنا پر اٹھا رہی ہے۔ اپنی پیشہ ورانہ زندگی کا بیشتر حصہ گزارنے کے بعد حمید سجالی کی پاکستان واپسی ایک حیرت انگیز قدم ہے اور بلاشبہ ای ایف یو کے لیے ایک نیک شگون ہے۔ شرافت، سجاد حیدر اور حمید اپنا ملک چھوڑ کر چلے گئے، اس لیے کہ وہ سمجھتے تھے کہ وہاں ان کے لیے بہتر مواقع موجود تھے۔ وہ صحیح نکلے اور انھوں نے اپنے پیشے میں بہت کامیابی حاصل کی۔ مگر بالآخر انھیں اپنے

ملک واپس ہونا پڑے گا، یا پھر انگلستان یا امریکا جانا ہوگا۔

اپنے دوست شرافت کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں زندگی سے کسی شکایت کی کوئی وجہ نہیں۔ وہ آج بھی اپنی پیشہ ورانہ مصروفیات سے لطف حاصل کرتے ہیں۔ ان کے اپنے الفاظ میں انھیں ''زندگی سے کوئی شکوہ نہیں۔ زندگی مجھ پر بہت مہربان رہی ہے۔ میں لندن میں رہا ہوں اور وہاں اپنا کاروبار کیا ہے۔ میں دُبئی آیا اور یہاں ایک بڑا ادارہ قائم کیا ہے میں جس کا چیئر مین ہوں اور شہر کے کچھ صاحبِ حیثیت باشندے ڈائریکٹر ہیں۔ ہم کامیاب کاروبار کر رہے ہیں۔ ہمارے بچے اچھی حالت میں ہیں۔ ہم سب پُرسکون زندگی گزار رہے ہیں اور ہمارے پاس خوش وخرم رہنے کے لیے ہر طرح کا جواز موجود ہے۔''

ان کے پیش کردہ خلاصے کا ایک ایک حرف خالص محسوسات سے مملو ہے۔ مجھے اس کا پورا یقین ہے۔ اس کے باوجود کچھ ہے جو مجھ کو آزردہ کر دیتا ہے۔ میری خواہش ہے، بلکہ امید ہے کہ میرے دوست شرافت مجھے معاف فرمائیں گے، اگر میں یہ کہوں کہ وہ ملک جس کو یہ اپنا وطن کہتے ہیں، اس غیر معمولی شخص کی تہ در تہ صلاحیتوں سے فیضیاب ہوسکتا تھا اگر یہ اپنے ملک ہی میں قیام کرتے، جس کے ساحل پر اٹھارہ برس کی عمر میں ان کے قدم پڑے تھے۔ انھوں نے نئے سرے سے اپنی زندگی بنائی تھی۔ انھوں نے ایسٹرن فیڈرل یونین کی بے مثال کامیابی میں نمایاں کردار ادا کیا تھا جو ان کی عزت اور ان کے لیے شکریے کی مقروض ہے۔

اگر انھوں نے ملک سے باہر قدم نہ نکالا ہوتا تو اپنی دھرتی کے لیے کچھ نہ کچھ کیا ہوتا، اگر افسر شاہی کی لاپرواہی ان کو یہ قدم اٹھانے سے روک دیتی۔ یہ شاید ایک بہت بڑے معمار اور ہنر مند کاروباری شخص ہوتے۔

بہر حال، اپنی حیثیت میں یہ ایک حیرت انگیز انسان ہیں، ایک ایسے انسان جو اس بات پر فخر کر سکتے ہیں، اپنی شریکِ زندگی سلطانہ کی معیت میں وہ بہت کچھ حاصل کر سکتے تھے۔

۱۹۶۲ء میں ساجد زاہد اور سعید احمد اپنی مالکہ مکان کے ساتھ

ساجد زاھد

ایک آزاد منش

ساجد زاہد جیسے انسان سے شناسائی ایک حیرت انگیز تجربہ ہے اور ان کا دوست بن جانا ایک بڑی رعایت ہے۔
میں شاید ہی کبھی ان جیسے منفرد، منخنی، خود پسند، راست باز اور سیدھے سادے انسان سے ملا ہوں گا۔ ایک مشہور باپ کے بیٹے، جن سے وہ بہت محبت کرتے تھے مگر جن کا سایہ زندگی بھر ان کے پیچھے لگا رہا ہے۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ ساجد نے کبھی اپنے باپ کے نام کو اپنے لیے بار تصور کیا تھا مگر بلاشبہ یہ نام ان کے ذہن کی نشو ونما اور ان کی ذاتی ترقی میں دخیل رہا ہے۔
ہم اور وہ، دونوں ایک ہی عمر کے ہیں، نوعمری کے دور میں ہمارے تجربات بھی مشترک رہے ہیں، جن پر سیاست اور تباہ کن حالات، خواہ وہ جنگ، فسادات یا سول نافرمانی کی صورت میں ہوں، اثر انداز رہے ہیں۔
ساجد زاہد ۱۹۳۰ء میں ایک معروف سرکاری افسر کے گھر پیدا ہونے والے تین بیٹوں میں سے ایک تھے۔ ان کے والد، جناب زاہد حسین، اسٹیٹ بینک آف پاکستان کے پہلے گورنر کی حیثیت سے آج بھی یاد کیے جاتے ہیں۔ تقسیمِ ہند سے قبل وہ برطانوی ہند کی سول سروس کے ایک رُکن تھے۔ برطانوی ہند میں ان کی آخری تعیناتی ریلوے کے مالیاتی کمشنر کی حیثیت سے ہوئی تھی۔ دوسری عالمی جنگ کے اختتام کے فوراً بعد وہ حیدر آباد دکن کے وزیر مالیات بنادیے گئے تھے۔ مگر سرکاری معاملات میں نظام سے ان کی نہیں بنی اور انھوں نے فروری ۱۹۴۷ء میں اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ یہ سال اس پورے خطے کے لیے بہت اہم تھا۔ زاہد اور ان کے بیٹے جب پرل کانٹی نینٹل ہوٹل میں مجھ سے ملنے آئے، اس سے پہلے ہم لندن میں اس وقت ملے تھے جب وہ کریڈٹ اینڈ کامرس انشورنس کمپنی کے ابتدائی دنوں میں اس سے منسلک تھے۔ اپنی گفتگو کے دوران ساجد نے اپنی یادداشت کو کھنگالتے ہوئے اپنے والد کے بارے میں بتایا، ''اس وقت ان کی عمر چون برس تھی، اور انھوں نے ریٹائر ہونے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ شاید آپ کو علم ہو کہ ان دنوں ریٹائر ہونے کی عمر پچپن برس ہوتی تھی۔ ان کے ہاتھ میں ایک ٹکٹ تھا جو انھیں سیدھا لاہور لے جاتا، جہاں انھوں نے ریٹائر ہونے کے بعد بس جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ مگر دلّی میں انھیں اس وقت ریل گاڑی سے اتار لیا گیا جب قائدِاعظم نے یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ میرے والد کو علی گڑھ یونی ورسٹی کا وائس چانسلر بنادیا جائے گا۔ میرے والد نے یہ فیصلہ قبول کرلیا تھا۔ کچھ بہت مصروف ہفتے گزر گئے۔ وہ ایک مختصر عرصے کے لیے لاہور آئے، جہاں ساجد کالج میں تعلیم پا رہے تھے۔ پھر وہ دلّی واپس چلے گئے جہاں وہ یونی ورسٹی سے تقرری کے احکامات کے منتظر رہے۔ احکامات اپریل کے مہینے میں ملے۔ پھر وہ علی گڑھ چلے گئے اور چند ہفتوں بعد گرمی کی چھٹیاں ہوگئیں اور ہم سب گرم موسم سے دور رہنے کے لیے کوئٹے چلے گئے۔ وہاں ہم نے سنا کہ پاکستان یقیناً بنے گا۔ قائدِاعظم نے ۳؍جون کو اپنی مشہور تقریر کی تھی۔ اس کے بعد کافی عرصے تک ان کی میرے والد سے ملاقات نہیں ہوئی۔ تقسیم کی کونسل کے ساتھ میرے والد لاہور میں اور اس کے بعد دلّی میں تھے۔ اس لیے ہم اہلِ خانہ ان کے بغیر ہی اگست ۱۹۴۷ء کی ابتدا میں،

پاکستان کے قیام سے چند دن قبل، کراچی منتقل ہو گئے۔ جناح صاحب نے میرے والد کو دلی میں پاکستان کا پہلا ہائی کمشنر بنا دیا تھا۔ و
حکومت سے بات چیت کے لیے اکثر کراچی آتے رہے۔ مگر میرا خیال ہے کہ مارچ یا اپریل ۱۹۴۸ء میں انھیں اس عہدے سے فارغ کر کے
اسٹیٹ بینک کا گورنر بنا دیا گیا تھا۔''

میں خود جنگ اور اس سے ہونے والی تباہیوں، کروڑوں افراد کے دیس نکالے اور ہجرتوں سے گزر چکا ہوں۔ اس لیے میں ایسے
لوگوں کے حالات میں خاص دل چسپی لیتا ہوں۔ تقسیمِ ہند کے بعد بہت سے انسان ایسے ہی تجربے سے گزرے تھے جنھیں ایک جگہ سے
دوسرے جگہ جانا اور بسنا تھا۔ اسی لیے میں نے ساجد سے سوال کیا تھا کہ تقسیم ہند کے موقعے پر کبھی انھیں یا ان کے اہلِ خاندان کو ذاتی طور پر
ایسے تجربوں سے دوچار ہونا پڑا تھا؟ خوش قسمتی سے ان کا جواب نفی میں تھا۔ انھوں نے بتایا کہ'' کراچی میں انھوں نے کوئی مار کاٹ نہیں دیکھی
سوائے کچھ لوٹ مار کے۔ کچھ لوگ ان سکھوں کے پیچھے پڑ گئے تھے جو ملک کے بالائی حصے سے کراچی آ گئے تھے تا کہ یہاں سے جہاز میں
سوار ہو کر ہندوستان جا سکیں۔ میں نے ذاتی طور پر بس اتنا ہی دیکھا تھا۔ مگر ہمیں علم تھا کی سرحد کے پار دونوں طرف کیا ہو رہا تھا۔ یہ پاگل
پن تھا، ایسے پیانے پر مار کاٹ ہو رہی تھی جیسی پہلے کبھی نہیں دیکھی گئی تھی۔ لہٰذا ہمارے نزدیک آزادی ایک اچھی چیز نہیں تھی، یا ایسی چیز جس کو
پلٹ کر دیکھیں تو خوشی محسوس ہو۔ بہت سے خاندان ایسے بٹ گئے تھے کہ ایک کو دوسرے کی اتنی خبر بھی نہ تھی کہ وہ زندہ ہیں یا مار دیے گئے۔
ہمیں یہاں سکون سے بسنے میں بہت عرصہ لگا تھا۔''

ان کے بچپن کا سب سے طویل عرصہ دلّی میں گزرا تھا جہاں وہ ابتدائی تعلیم پا رہے تھے۔ انھوں نے بتایا،'' ہم نے کئی بار مکان
تبدیل کیے تھے مگر میرے بچپن کا مرکز دلّی ہی تھا، ویسا ہی جس میں انسان کو اپنے اطراف ہونے والے واقعات سے آگاہی ہونے لگتی ہے
جہاں اس کو احساس ہونے لگتا ہے کہ زندگی کیا ہے اور کیا ہونے والا ہے۔ میری یادداشت پشاور سے شروع ہوتی ہے جہاں ہم ۱۹۳۳ء سے
۱۹۳۷ء تک رہے تھے۔ مگر یہ سب ایک خواب کی مانند دھندلا اور تاریک سا ہے۔'' میں نے ان سے سوال کیا کہ چوں کہ ان کے والد اتنے اہم
اور مشہور سرکاری افسر تھے اور برّصغیر کے رہنمایانِ آزادی سے، بالخصوص قائدِ اعظم سے ان کے تعلقات تھے تو کیا کھانے کی میز پر بھی کبھی ان
مسائل پر گفتگو ہوتی تھی۔ انھوں نے بلا کسی تامّل کے جواب دیا کہ'' یہ مسائل زیرِ گفتگو آتے ضرور تھے مگر اس حد تک نہیں جس کی آپ توقع کر
رہے ہوں گے۔'' اور پھر انھوں نے فوراً ہی ایک دل چسپ بات کہی،'' ہم تین بھائی تھے اور ہم تینوں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ ہم میں سے کوئی
بھی سرکاری ملازمت میں نہیں جائے گا۔ میرا چھوٹا بھائی، جس کا انتقال ہو چکا ہے، چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ بنا۔ دوسرا وکیل بنا اور آج کل عدالت
عالیہ پاکستان میں جج ہے۔ میں کیمیا پڑھنا چاہتا تھا مگر میری صحت کے باعث ڈاکٹروں نے اس کے خلاف مشورہ دیا۔''

مجھے اس بات پر بڑی حیرت ہوئی اس لیے کہ ان کے والد پاکستان کی ایک معروف شخصیت تھے، وہ اسٹیٹ بینک کے گورنر رہے
تھے جو دنیا کی کسی بھی حکومت میں ایک بڑا عہدہ ہوتا ہے۔ تو پھر ان کے تینوں بیٹوں کا ایسا رویہ کیوں؟ وہ مسکرائے، چند ثانیے توقف کیا اور
بولے،'' بہت سے لوگ ہمارے رویے کو نہیں سمجھے ہیں۔ کئی اہم عہدوں پر ہمارے والد کو بہت سارے کام کرنے پڑتے تھے۔ ہم نے یہ بھی
دیکھا تھا کہ سرکاری ملازموں کو اکثر کسی نہ کسی نوعیت کی بے عزتی بھی برداشت کرنی پڑتی ہے۔ میں اس کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا نہ ہی
سیاسی معاملات میں الجھنا پسند کروں گا۔ لیکن اگر میں اپنے والد کی ملازمت کے آخری برسوں پر نظر ڈالتا ہوں تو یہ صاف نظر آتا ہے کہ پنجابیوں
اور بنگالیوں کے درمیان برتری کی ایک رسہ کشی جاری تھی۔ اس کش مکش میں وہ کسی کا ساتھ دینا نہیں چاہتے تھے اس لیے یہی بہتر تھا کہ وہ اس
جنجال سے نکل جائیں۔ یہی وجہ تھی کہ ہم تین بھائیوں نے آزاد پیشوں میں جانے کا ارادہ کر لیا تھا جہاں ہم کسی کے ملازم نہ ہوں۔ میں اپنے
بارے میں فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ ڈاکٹروں کے مشورے کے باعث مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میں نے بہت سے راستے تلاش کیے۔ پہلے تو
معاشیات کی طرف خیال گیا، پھر طباعت کا کام شروع کرنے کا ارادہ کیا اور بالآخر Actuary بن گیا۔''

ساجد زاہد نے ایکچوریل سائنس کی تعلیم انگلستان میں حاصل کی، وہیں سے تمام امتحان پاس کیے اور پاکستان آ گئے۔ وہ پہلے پاکستانی ایکچوری تھے جو کسی پاکستانی بیمہ کمپنی میں ملازم ہوئے۔ ساجد زاہد سے قبل پاکستان سے دو ایکچوری بنے تھے۔ ان میں سے ایک مسٹر خلفے (Khalfe) تھے، جنھیں ان کے ابتدائی مددگار مسٹر روشن علی بھیم جی بمبئی سے لے آئے تھے۔ مسٹر خلفے پاکستان کے سب سے طویل عرصے تک رہنے والے کنٹرولر آف انشورنس تھے۔

میں نے طے کرلیا تھا کہ پاکستان میں رہوں گا اور کسی پاکستانی کمپنی میں ملازمت کروں گا۔ میرے پاس اتنا سرمایہ نہیں تھا کہ میں اپنی پریکٹس شروع کرتا۔ مجھے نہ پاکستان میں بیمے کے بارے میں کچھ معلومات تھیں، نہ اس ملک کے بیمے کی صنعت کے بارے میں۔ بس مجھے اتنا علم تھا کہ ایسٹرن فیڈرل انشورنس اس ملک کی سب سے بڑی بیمہ کمپنی تھی اور میں نے اسی میں ملازمت کی درخواست بھیج دی۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ عبدالرحمٰن صدیقی اس کے مؤسسین میں سے تھے جن کے میرے والد سے مراسم تھے۔ کلکتے میں فسادات کے بعد ان سے میری ملاقات ہوئی تھی، بعد میں ہم دلّی میں بھی ملے تھے۔ وہ بہت دبلے پتلے آدمی تھے اور میرے خیال میں وہ بہت غصیلی سیاسی شخصیت تھے اور اسی باعث شہر میں مشہور تھے۔ ان کو زیر کرنا آسان نہ تھا، مگر مجھے ان سے کوئی سروکار نہیں تھا اس لیے کہ جب میں ان سے ملا تھا مجھے کسی انشورنس کمپنی میں ملازمت کا خیال تک نہیں آیا تھا۔ ہم لوگ ان کو عبدالرحمٰن بنگالی کہا کرتے تھے اس لیے کہ ایک اور عبدالرحمٰن صاحب ہوا کرتے تھے، دونوں ایک ہی جسامت کے تھے اور اپنی نسل کے غیر معمولی لوگوں میں سے تھے جو مسلمانوں کی رہنمائی میں پیش پیش رہا کرتے تھے۔ ان میں سے ایک کا بہت جلد انتقال ہو گیا تھا، اور عبدالرحمٰن بنگالی نے تجارت اختیار کر لی تھی۔

بہرحال میں نے ای ایف یو میں ملازمت کی درخواست بھیج دی۔ حیدر صاحب نے میرا انٹرویو کیا جو اس وقت PIC میں شامل ہو چکے تھے اور ان کی جگہ کسی اور کا تقرر نہیں ہو سکا تھا۔ یہ ۱۹۶۱ء کا واقعہ ہے۔ میرے لیے مول بھاؤ کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ ای ایف یو والے ایک ہزار روپے سے زیادہ دینے پر تیار نہ تھے جب کہ امریکن لائف سے مجھے تین ہزار روپے ملنے کی توقع تھی۔ بڑی مشکل سے معاملہ ڈیڑھ ہزار پر ٹھہرا۔ میں اپنے والد کے حوالے سے حیدر صاحب سے اس وقت سے واقف تھا جب وہ بھوپال میں وزیرِ مالیات تھے اور ہم لوگ تو ایک رات ان کے گھر ٹھہر بھی چکے تھے۔"

میرے خیال میں ساجد زاہد اور ای ایف یو کا ساتھ خوش آئند تھا۔ ہم اور وہ دونوں ایک دوسرے سے اچھی طرح واقف ہو گئے تھے۔ ہم اور وہ دونوں مشہور 'تنظیمی کمیٹی' کے ارکان تھے جس کی تشکیل ای ایف یو کے چیف ایگزیکٹو کا پہلا بڑا فیصلہ تھا جو انھوں نے ۱۹۶۱ء میں کمپنی کی باگ ڈور سنبھالنے کے بعد کیا تھا۔ اس کمیٹی نے کمپنی کے پرانے انتظامی ڈھانچے کے بارے کچھ سخت فیصلے کیے تھے۔ کمپنی کے چیئرمین شرافت والا جاہی تھے، ہم تینوں، یعنی میں، ساجد اور شرافت ایک ہی برس ۱۹۳۰ء کے پیدا ہوئے تھے۔

ساجد زاہد کہتے ہیں، "مجھے ای ایف یو میں کام کرنے میں بہت لطف آیا۔" اس جملے کو انھوں نے کئی بار دہرایا۔ "واقعی لطف آیا اس لیے کہ ہم نے نئی راہیں بنانے میں کامیابیاں حاصل کیں۔ سب سے اہم گروپ انشورنس اسکیم تھی۔ بلاشبہ پاکستان کی فوج کا بیمہ میرے زمانے کا سب سے اہم واقعہ تھا۔ دوسرا واقعہ تعلیم اور تربیت کے میدان میں کمپنی کی پیش رفت تھا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ جب ہم ایک ساتھ تھے تو آپ نے بھی اس پر بہت زور دیا تھا کہ ملک میں بیمے کی صنعت کے لیے کارکنوں کی تیاری اور بالخصوص ایکچوریل سائنس کے میدان میں کمپنی کی کامیابی ایک بڑا کارنامہ تھا۔ صرف ای ایف یو نے کئی ایکچوری تیار کیے تھے جو ہم سے کہیں بڑا ادارہ اسٹیٹ لائف آج تک نہیں کر سکا ہے۔ صرف گیارہ برسوں کے عرصے میں یہ ایک بہت بڑا کارنامہ تھا۔ یہ سب کچھ ٹھپ ہو کر رہ گیا، مگر اس کے لیے ہم صرف مسٹر بھٹو کو ذمے دار نہیں ٹھہرا سکتے اس لیے کہ اس زمانے کے انتخابات کے لیے ہر سیاسی پارٹی کے منشور میں زندگی اور جنرل، بیمے کی دونوں اصناف کو قومی ملکیت میں لیا جانا شامل تھا۔ ہر سیاسی پارٹی کی نگاہیں ان کے سرمائے پر لگی ہوئی تھیں۔ ان میں کسی کو بیمے کے بارے میں کچھ بھی علم نہ تھا، بس

وہ تو اس کو سیاسی رعایت کے طور پر استعمال کرنا چاہتے تھے۔''

ساجد زاہد نے ای ایف یو بہت جلد چھوڑ دیا تھا اس لیے کہ وہ خود اپنے مالک بننا چاہتے تھے تا کہ وہ بیمہ داروں کے تحفظ کا فریضہ انجام دے سکیں۔ اگر چہ کمپنی کی انتظامیہ سے ان کے مضبوط رشتے قائم ہو چکے تھے، مگر انھوں نے اپنی پریکٹس قائم کرنے کی غرض سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ یہ وہی زمانہ تھا جب مسٹر بھیم جی کی شمولیت کی وجہ سے کمپنی نئی بلندیوں کو چھو رہی تھی اور مسٹر بھیم جی بیمے کے سب زیادہ بارسوخ کاروباری بن چکے تھے۔ ساجد کہتے ہیں، ''پاکستان میں مسٹر بھیم جی ہی تھے جو بیمے میں بصیرت رکھتے تھے۔ آج تک ان کے سوا کوئی شخصیت ایسی نہیں تھی جس کے پاس تصورات بھی تھے اور وہ ان کو عمل میں لانا بھی جانتے تھے۔ میں پہلی ملاقات ہی میں اس بات کا قائل ہو گیا تھا کہ وہ اس کمپنی کو بڑی بلندیوں تک لے جا سکتے ہیں۔ میرے لیے وہ باپ جیسے تھے۔ مجھ پر ان کے اعتماد نے مجھے کام کرنے کا حوصلہ دیا تھا۔ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں، میں اس قسم کا انسان نہیں ہوں جو کسی کے حکم پر چل سکوں اور میرے ساتھ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ میں جو کچھ نہیں کرنا چاہتا تھا وہ کرنا پڑا ہو۔ مگر زندگی میں ایسے مواقع آتے ہیں، جب آپ ملازمت میں ہوں تو آپ کو یہ کچھ کرنا پڑتا ہے مگر مجھے کبھی ایسا نہیں کرنا پڑا تھا۔''

میں ان سے یہ پوچھنا بھول گیا کہ اپنی ابتدائی زندگی میں کیا انھوں نے کسی خاص شخصیت کو اپنا ماڈل سمجھا تھا۔ خاندان کے اشخاص کے علاوہ میرے خیال میں قائدِ اعظم شاید ایسی شخصیت رہے ہوں۔ یہ میں اس لیے نہیں کہہ رہا ہوں کہ قائدِ اعظم کو اپنا معیار بنانا ہمیشہ آسان ہوتا رہا ہوگا۔ مگر میں یہ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اس کتاب کے سلسلے میں ہماری ملاقات کے دوران ساجد زاہد نے بار بار قائدِ اعظم کا نام لیا تھا۔ بلکہ انھوں نے کئی واقعات کا بھی ذکر کیا تھا میں جن سے ناواقف تھا، نہ ہی میں نے ان کے بارے میں کہیں پڑھا تھا۔ انھوں نے ایک واقعہ اپنے والد کے حوالے سے بیان کیا تھا جو ان کے والد نے لکھا تھا۔ اس خط میں زاہد صاحب نے لکھا تھا کہ جناح صاحب کو ڈاکٹروں نے کچھ دوائیں لکھی تھیں جو انھوں نے کھانے سے انکار کر دیا تھا۔ جب جناح صاحب کو بتایا گیا کہ حکومت نے حکم دیا ہے کہ یہ دوائیں آپ کو دی جائیں تو جواب میں جناح صاحب نے کہا کہ ''سوائے خدا کے میں کسی کا حکم نہیں مانتا۔''

۱۹۱۲ء میں کانپور میں پیش آنے والا ایک اور واقعہ بیان کیا جاتا ہے۔ حکام ایک سڑک کو کشادہ کرنے کے لیے ایک مسجد کا کچھ حصہ گرانا چاہتے تھے۔ نتیجے کے طور پر کانپور میں فسادات پھوٹ پڑے جس میں کئی جانیں چلی گئیں۔ کچھ مسلمان رہبر جناح صاحب سے ملاقات کے لیے گئے جب وہ بمبئی میں وکالت کرتے تھے اور ان سے پیروی کی درخواست کی۔ جناح صاحب نے کاغذات کے معائنے کے بعد کہا کہ حکومت کا قانونی موقف صحیح ہے اور انھیں نے یہ مقدمہ لینے سے انکار کر دیا۔ اگر جناح صاحب یہ مقدمہ لے لیتے تو اس بات کا پچاس فی صد امکان تھا کہ مصالحت ہو جاتی مگر یہ جانتے ہوئے کہ حکومت کا موقف درست تھا، جناح صاحب نے مقدمہ لینے سے انکار کر دیا حالاں کہ اس کے ذریعے ان کو بہت شہرت ملتی۔ ساجد زاہد کے مطابق وہ قانون کے پاسدار انسان تھے۔

ساجد نے اپنی پریکٹس شروع کی، جس سے وہ آج بھی منسلک ہیں، تو ہم ایک دوسرے سے بچھڑ گئے۔ ان کے صاحب زادے جو اس کتاب کے سلسلے میں ہماری ملاقات کے دوران اپنے والد کے ساتھ آئے تھے، بہت محنتی، ذہین اور ہمت رکھنے والے نوجوان لگتے ہیں۔ ان سے بات کر کے مجھے خوشی ہوئی تھی۔ انھیں اپنے ملک سے بہت محبت ہے اور وہ اس کے روشن مستقبل پر یقین رکھتے ہیں۔ ان کے مطابق ''پاکستان میں وہ تمام خصوصیات ہیں جو ملکوں کو دنیا میں اہم مقام عطا کرتی ہیں، ہمارے پاس افرادی قوت ہے، تجربے کار پیشہ ور لوگ ہیں بس اس ملک میں ایک ہی کمی ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم اچھے رہنما پیدا کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے جو ملک کی سربراہی کر سکتے۔ اہم پیشوں میں ہمارے پاس قابل لوگ ہیں، ہم نے بینکنگ کے شعبے میں دنیا کے بہترین دماغ پیدا کیے ہیں۔ پاکستان میں تربیت یافتہ بینکر کو دنیا کے کسی بھی خطے میں ملازمت مل سکتی ہے۔ اور ہم نے دنیا کے کئی اہم ڈاکٹر پیدا کیے ہیں۔ اب ہم اپنے تعلیمی اداروں کی ترتیبِ نو کر رہے ہیں ہم کاروباری ادارے بنا رہے ہیں، لہٰذا ہمارے پاس بہت اچھے دماغ ہیں۔ ہمیں ایسے لوگوں کی ضرورت ہے جو ملک کی رہنمائی کر سکیں۔ مگر

اب لوگوں نے حالات کو سمجھنا شروع کر دیا ہے۔ کراچی میں اب لوگ ایسے لیڈروں کو ووٹ دیتے ہیں جو ان کے جیسے مکانوں میں رہتے ہیں، موٹر سائیکل پر سفر کرتے ہیں اور تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ مگر مشکل یہ ہے کہ اس قسم کی ترقی صرف ملک کے اسی حصے میں ہو رہی ہے۔ ملک کے دوسرے حصوں تک اس کے پہنچنے میں ابھی وقت لگے گا۔''

ایک فخر کرنے والے باپ کی طرح ساجد اپنے بیٹے کی باتوں پر اثبات میں سر ہلاتے رہے۔ اپنی خوب صورت سپید ڈاڑھی میں، جو میں نے پہلی بار دیکھی تھی، وہ ایک بزرگ دانشور، کسی قبیلے کے سردار لگ رہے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ ایک دن وہ اس منصب پر فائز ہوں گے۔ جب میں نے ان کی توجہ اس طرف دلائی تو انھوں نے مسکرا کر کہا، ''آپ کی نوازش ہے، مگر مجھ سے زیادہ عمر کے بہت سے لوگ ابھی زندہ ہیں۔ اس سلسلے میں عمر بہت اہم ہوتی ہے۔ لیڈر کے رتبے تک پہنچنے کے لیے اسّی برس کی عمر چاہیے ہوتی ہے۔''

مجھے یقین ہے کہ ایک دن میں اپنے دوست سے ملوں گا جب وہ اپنے قبیلے کے بزرگ سرداروں میں سے ہوں گے۔ اپنی فطرتی جھینپ اور دروں بیں طبیعت کی وجہ سے، جو ان کے سماجی رویوں پر اثر انداز ہوئی ہے، وہ کبھی خطرات اور چیلنج سے اچھی طرح نمٹ نہیں سکتے۔ زندگی کے بارے میں ان کا فلسفیانہ ذہن حقائق سے کبھی نظریں نہیں چرا سکتا۔ ان کو قدرت نے دانش کی نعمت سے نوازا ہے۔ میرے اندازے کے مطابق وہ ہندوستان اور پاکستان کی تعلیم یافتہ نسل کے اس متوسط طبقے کے نمائندے ہیں جو ماضی کے جاگیردار اور پاکستان ہجرت کرنے والی نسل سے ابھرنے والی شخصیت ہیں، جو نہ روایت کو بالکل چھوڑنا چاہتا ہے نہ نئی قدروں کا منکر ہونا چاہتا ہے۔ سرسید کے شیدا ہونے کی وجہ سے میں سمجھتا ہوں کہ ساجد دراصل ان کے شاگرد جیسے ہی ہیں۔ ان کی جودتِ طبع ان کے کانوں میں چپکے چپکے کہتی ہے کہ ان معنوں میں ان کا استاد صحیح تھا کہ یہ مسلمانوں کے لیے زندگی اور موت کا سوال تھا۔ اگر چہ ساجد نے اس مسئلے پر مجھ سے کبھی کھل کر بات نہیں کی ہے مگر مجھے یقین ہے کہ جب وہ اس کتاب کو پڑھیں گے تو مجھ سے ضرور متفق ہوں گے۔ میں یہ بھی پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ سرسیّد کا پیغام ان کی آنے والی نسلوں تک ساجد زاہد جیسے 'شاگردوں' ہی کے ذریعے پہنچا ہے۔

ساجد کے بیٹے کا کہنا ہے کہ ''جہاں تک پاکستان کے مستقبل کا سوال ہے یہ بہت سیدھا سادا سا ہے۔ ہندوستان کو مسلمانوں کی ایک بڑی آبادی قبول نہیں۔ یا تو وہ ان کو پاکستان میں دھکیلنے کی کوشش کرے گا یا کسی طرح انھیں کشمیر میں بند کر دے گا، جیسا کہ وہ کر رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بھارت نے مشرقی پاکستان پر قبضہ نہیں کیا، ان کو بنگلہ دیش کی صورت ہی میں چھوڑ دیا ہے۔ لہٰذا پاکستان تو رہے گا اس لیے کہ کسی کو اس کی زمین پر قبضہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ مگر، اگر اس میں کوئی تبدیلی آنی ہے تو مجھے یقین ہے کہ خود اسی میں سے ابھرے گی۔ آنے والی نسل میری نسل سے بہت بہتر ہے۔ یہ لوگ زیادہ پڑھے لکھے ہیں، مستقبل پر نظر رکھنے والے ہیں اور زیادہ محنتی ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ان کو بہتر صلہ ملے گا، اور مجھے ان سے اتفاق ہے۔''

ساجد زاہد خود اپنے اجداد کی روایات اور قدروں سے جُڑے ہوئے ہیں۔ وہ بہت مذہبی آدمی ہیں مگر اسلام کی اصل روح کے مطابق جو قرآن سے مشتق ہو، نہ کہ ان تاویلوں اور تفاسیر سے جو 'خود ساختہ' بنیاد پرستوں کی ہوں۔ اس کے باوجود وہ اصولوں کا سودا کرنے کے قائل نہیں۔ میں ان کے والد سے نہیں ملا مگر جہاں تک مجھے علم ہے، یقیناً ان کے بیٹے میں ان کا معنوی وجود ڈھونڈا جا سکتا ہے۔ ساجد نے ایک بار اپنے خاندان کا ایک مخطوطہ دکھایا تھا جس کی شروعات ۱۹۲۵ء میں ان کے والد نے کی تھی جب انھیں ایک رسالے 'پیغام اتحاد' کی ادارت سونپی گئی تھی۔ ان کے والد کے کاغذات میں ایک طویل فہرست بھی تھی جس میں ان کے تمام بالغ اعزّہ کے نام، عمریں، تعلیم، پیشہ اور موجودہ آمدنی کی تفصیلات درج تھیں۔ اس سے یہ معلوم کرنا مقصود تھا کہ ان کے قبیلے کے کون سے لوگ ہیں جنھیں مدد کی ضرورت تھی اور ان کو کیا مدد پہنچائی جا سکتی تھی۔ ان کاغذات میں تقریباً چالیس خطوط بھی تھے جو ۱۸۵۹ء کے امتدادِ زمانہ سے بچ رہے تھے۔ ان سے پتا چلتا تھا کہ ان کے خاندان کے لوگ جے پور اور بیکانیر کی ریاستوں میں ملازم تھے اور یہ بھی کہ ان دنوں میں ان ریاستوں میں فارسی سرکاری زبان کے

طور پر رائج تھی۔ ان خطوط کے دل چسپ پہلو وہ تھے جن میں ان کے بزرگوں نے فرنگیوں کے لباس، رہن سہن اور زبان کے خلاف جذبات کا اظہار کیا تھا۔ وہ لوگ ہرگز سرسیّد کی تعلیمات پر کہ ہندوستانیوں کو نئے انداز کو اختیار کرنا چاہیے عمل کرنے کو تیار نہیں لگتے تھے۔ ان خطوط میں سے ایک جو ۱۸۶۰ء میں لکھا گیا تھا، ایک خاندانی بزرگ نے اس بات پر اپنے خورد کی سرزنش کی تھی کہ وہ فارسی زبان سیکھنے کے بجائے عربی پڑھ رہا تھا۔ انھوں نے لکھا تھا 'اس طرح تم اپنی کفالت کس طرح کرسکو گے؟'

ساجد کا بیٹا کہہ رہا تھا، ''دیکھیے، پاکستان کے تعلیمی اداروں نے کس اعلیٰ معیار کے لوگ تیار کیے ہیں۔ یہ ادارے واقعی بہت اچھے ہیں اور یہ زیادہ اچھے ادارے قائم کرنے کے بارے میں پُرعزم ہیں۔'' ساجد نے بھی اس میں اضافہ کرتے ہوئے کہا، ''کیا آپ کبھی ان لوگوں سے ملے ہیں جو پاکستان میں کام کرنے والے ملٹی نیشنل اداروں میں کام کررہے ہیں۔ میری مراد پاکستانی لوگوں سے ہے؟ اگر نہیں تو ضرور ملیے تاکہ آپ دیکھ سکیں کہ جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں وہ حقیقت پر مبنی ہے۔ اور انھیں لوگوں کے ہاتھ میں اس قوم کا مستقبل ہے۔''

دونوں باپ بیٹے مجھے ایک جذباتی کیفیت میں چھوڑ کر چلے گئے۔ اس سے پہلے کبھی میرے ساتھ کام کرنے والے ایسے معاملات پر مجھ سے اتنے قریب آئے ہوں گے، نہ ہی ہم نے کبھی ایسے موضوعات پر باتیں کی تھیں۔ اب مجھے اس بات کا صحیح ادراک ہوا تھا کہ ساجد زاہد کیوں کسی کی ملازمت نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اب مجھے اندازہ ہوا کہ ان کا ذہن کتنا باریک بیں اور تجزیاتی تھا جس میں ان کی خاندانی سوچ کی جھلک نمایاں تھی۔ سات برس ای ایف یو اور اس کے بعد CCI London سے ان کے رشتے اپنے واضح نشانات ثبت کر گئے تھے۔

ذاتی طور پر میں ہمیشہ سے ان کی دانشورانہ دیانت داری کا قائل تھا۔ ان جیسے ہی دوستوں کے توسط سے مجھے برصغیر کے لوگوں کو اور ان کی تاریخ کو سمجھنے میں مدد ملی تھی۔

اور جہاں تک ای ایف یو سے ہمارے مشترکہ لگاؤ کی بات ہے تو مجھے اس بات کا یقین ہے کہ ساجد زاہد جیسے انسان کا اس ادارے سے انسلاک ادارے کی خوش قسمتی تھی۔ کمپنی ان کی پیشہ ورانہ صلاحیت سے، ان کے تصورات اور وسیع نظری سے معاملات کو دیکھنے اور ملک میں بیمے کی صنعت کی ترقی کے حوالے سے یقیناً بہت مستفید ہوئی تھی۔

نواب حسن، ۱۹۶۷ء میں ای ایف یو ہیڈ آفس کے منیجر کی حیثیت میں

نواب حسن اور ایس ایم معین الدین، باہمی اتفاق ہی ہماری قوت ہے

ای ایف یو کے وائس پریذیڈنٹ نواب حسن اپنے دوستوں ساجد زاہد (کنسلٹنگ ایکچویری)، میاں سعید احمد (سینئر وائس پریذیڈنٹ، لاہور) اور اقبال رضوی (چیف انجینئر، اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ) کے ساتھ ۱۹۷۰ء میں کمپنی کی اعلیٰ کارکردگی کی خوشی مناتے ہوئے

نواب حسن

سفید فام اشرافیہ کا ایک فرد

میرے لیے یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ یہاں 'مقدر' کا لفظ استعمال کیا جائے یا نہیں۔ مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ میں اور نواب حسن یشہ ورانہ راستے کے ایک اہم دوراہے پر متعارف ہوئے تھے اور ہم دونوں ایک دوسرے کی زندگی پر فیصلہ کن طور پر اثر انداز ہوئے تھے۔

یہ ۱۹۶۴ء کی بات ہے جب ایسٹرن فیڈرل میں میرا پانچواں سال تھا۔ مجھے اس تیزی سے ابھرتے ہوئے ادارے، اور اس میں کام کرنے والے لوگوں کی رفاقت پسند تھی۔ مگر مجھے اس بات کا بھی احساس تھا کہ میرا مستقبل میونخ ری انشورنس کمپنی، جرمنی سے مربوط تھا۔ مسٹر ھیم جی کو بھی اس بات کا احساس تھا۔ ہم اچھے دوست بن چکے تھے اور میں ان سے یہ وعدہ کر چکا تھا کہ جب تک وہ میرا متبادل تیار نہیں کر لیتے میں کراچی ہی میں رہوں گا۔ مسٹر بھیم جی میری کمپنی سے اس موضوع پر بات کر چکے تھے اور انھیں بھی یہ انتظام قبول تھا۔ ہم نے یہ بھی طے کرلیا تھا کہ میرا متبادل کوئی یورپی نہیں بلکہ مقامی ہوگا جس کی جڑیں اس سرزمین میں ہوں۔ تعجب نہیں کہ ہم دونوں کو اچانک بمبئی کی وست، نیو انڈیا انشورنس کمپنی کا خیال آیا جن سے ہمارے اچھے تعلقات تھے۔ مسٹر بھیم جی کئی برس تک پاکستان میں ان کے مفادات کی نگہداری کر چکے تھے۔ میں بھی انھیں ایک قابلِ اعتماد دوست سمجھتا تھا، اس لیے کی میری جرمن کمپنی نے ۱۹۵۱ء میں ہندوستان میں انجینئرنگ نشورنس کو متعارف کرانے میں ان کی مدد کی تھی۔ دراصل دوسری عالمی جنگ کے بعد نیو انڈیا انشورنس پہلی ایشیائی انشورنس کمپنی تھی جس سے یونخ ری نے براہِ راست اپنے کاروباری رابطے دوبارہ استوار کیے تھے۔ ہم نے سوچا کہ ہم اپنے مسئلے پر نیو انڈیا انشورنس کے ڈائریکٹر مسٹر ں کے شاہ سے کیوں نہ بات کریں وہ مسٹر بھیم جی سے ذاتی طور پر متعارف تھے اور میں بھی ان سے کئی بار مل چکا تھا۔ میں ای ایف یو میں ہتے ہوئے ان کی کمپنی کے تعاون سے کئی بار ہندوستان جا چکا تھا تا کہ اس خطے میں انشورنس کے بدلتے ہوئے حالات، اور ملازمین کی بیت کے حاصل مواقع کا جائزہ لے سکوں۔

صرف اپنے ملک ہی میں نہیں بلکہ سرحدوں کے پار بھی نیو انڈیا کی کاروباری ساکھ اچھی تھی۔ ان دنوں وہ عالمی سطح پر کاروبار کر ہے تھے۔ برطانوی اور امریکی اداروں کے برابر تو نہیں مگر اپنے خطے کے تناظر میں وہ ایک اچھے مقام پر تھے۔ وہ ہندوستان کے مشہور اور ہت بڑے ادارے ٹاٹا گروپ کا حصہ تھے اور اپنے ملک کی معاشیاتی ترقی میں ان کا بڑا حصہ تھا۔ مسٹر شاہ پیشے کے اعتبار سے ایکچوری تھے۔ ۱۹۵۰ء میں جب بیمے کی صنعت کو قومی تحویل میں لیے جانے کے باعث ان کی کمپنی کا ایک بڑا حصہ ان کے قبضے سے نکل گیا تو وہ اور ان کے ساتھی جنرل انشورنس کی مزید ترقی میں لگ گئے، اور بلاشبہ انھوں نے خالص پیشہ ورانہ انداز میں اس محاذ پر بہت اچھا کام کیا تھا۔ شاہ صاحب نے اور بھی اچھے کام کیے تھے مگر جو سب سے اہم کام کیا تھا وہ زیرِ تربیت افسروں کے لیے انڈین سول سروس کے خطوط پر افراد کے انتخاب اور ن کی تربیت کے لیے ایک مینجمنٹ ٹریننگ اسکیم بنائی تھی۔ اس کمپنی میں عالمی جنگ سے قبل بھی اسی قسم کی ایک اسکیم چل رہی تھی مگر وہ بہت

چھوٹے پیمانے کی تھی جس میں سال میں صرف ایک یا دو افراد کو تربیت کے لیے بھرتی کیا جاتا تھا۔ مسٹر شاہ خوب جانتے تھے کہ تربیت حاصل کر لینے کے بعد ان 'لڑکوں' کی اہلیت بازار میں بڑھ جائے گی اور وہ تیار تھے کہ پچاس فی صد تک 'لڑکے' کمپنی کو چھوڑ کر دوسرے اداروں میں ملازمت اختیار کریں گے۔ ان کا خیال تھا کہ چھوڑ کر جانے والے بھی تربیت دینے والے ادارے کے نام کو روشن کریں گے اور اس طرح نیو انڈیا کا رتبہ بلند ہوگا۔

میں اور روشن علی بھیم جی دونوں اس تربیتی اسکیم سے واقف تھے اور ہمیں امید تھی کہ نیو انڈیا کے تربیت یافتہ افسروں کے نہایت وسیع 'اسلحے خانے' سے اپنی کمپنی کے لیے ہم ایک مناسب فرد حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ چوں کہ ہمیں اپنے مطلب کے فرد کو تلاش کا طریقہ معلوم نہیں تھا، اس لیے ہم دونوں نے بمبئی جانے اور مسٹر شاہ سے اپنا مدعا بیان کرنے کا فیصلہ کیا۔ ہم نے یہ قدم اٹھایا مگر ہم دونوں اکٹھے نہیں گئے۔ ہم نے سوچا کہ پہلے میں جا کر مسٹر شاہ سے ملوں اس لیے کہ یہ میرا معاملہ تھا کہ مجھے ای ایف یو سے فراغت حاصل کرنی تھی اور اسی بنا پر مسٹر شاہ کی مدد درکار تھی۔ ہمارا یہ حربہ کامیاب ہوا۔ مسٹر شاہ بہت مہربان تھے اس لیے اور بھی کہ انھیں معلوم تھا کہ اس امداد سے نہ صرف ان کے پرانے دوست مسٹر بھیم جی بلکہ میونخ ری میں ان کے دوست بھی خوش ہوں گے۔ مسٹر شاہ نے بخوشی مدد کرنے کا وعدہ کر لیا اور مجھ سے دو دن کی مہلت مانگی اور کہا کہ میں اپنے دوست مسٹر بھیم جی کو لے کر ان سے ملنے آؤں۔ ہم نے ان کے کہنے پر عمل کیا۔

مسٹر شاہ نے کہا، ''میرا خیال ہے کہ میں آپ کے مطلب کا آدمی ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے نہ صرف وہ بہت خوش نظر آ رہے تھے بلکہ وہ کچھ فخر بھی محسوس کر رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا گویا ان کا قد بڑھ گیا ہو اور ان کی ہمیشہ چمکنے والی آنکھیں اور بھی روشن دکھائی دے رہی تھیں۔ پھر انھوں نے ہمیں ۱۹۴۸ء کے مشہور تربیتی افسروں کے جتھے میں سے ایک نہایت قابل اور کامیاب افسر نواب حسن کے بارے میں تفصیل سے بتایا، جو ذاتی مگر خفیہ وجوہ کی بنا پر پاکستان ہجرت کرنا بھی چاہتے تھے۔ انھوں نے نواب حسن کو بلا کر ہم سے ملاقات کرائی اور پہلی ہی نظر میں ہم دونوں نے ان کو پسند کر لیا۔ مسٹر بھیم جی نے کمال کر دکھایا اور چوبیس گھنٹوں سے پہلے ہی سارے معاملات طے ہو گئے۔ نواب حسن نے پاکستان آنے اور ای ایف یو کے جنرل انشورنس کے شعبے میں تکنیکی سربراہ بننے پر رضامندی ظاہر کر دی۔ اس طرح نواب حسن ۱۹۶۴ء میں میرے متبادل کے طور پر ڈی مینیجر ہیڈ آفس بنا دیے گئے۔

نواب حسن ۱۹۲۵ء میں ہندوستان کے مشہور صوبے یوپی میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی میں ان کے والد کا انتقال ہو گیا تھا اور ان کے چچا نے جو انڈین پولیس سروس میں تھے، اپنے بیٹوں کی طرح ان کی پرورش کی۔ نواب حسن نہایت ذہین طالب علم تھے۔ ۱۹۴۲ء میں انھوں نے علی گڑھ سے اوّل درجے میں گریجویشن کیا۔ تعلیم کے ختم ہونے پر وہ ریاست رامپور چلے گئے جو علی گڑھ سے قریب ہی تھی اور وہاں انھوں نے رضا ٹیکسٹائل ملز میں ملازمت کر لی۔ چند برس بعد انھوں نے بمبئی میں قائم ٹیکسٹائل ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا، ساتھ ہی ساتھ انھوں نے نیو انڈیا کی تربیتی اسکیم میں بھی درخواست دی تھی جو امتحانات میں نمایاں کامیابی کی وجہ سے منظور کر لی گئی تھی۔

اس طرح نواب حسن نے، میرے عزیز دوست اور انشورنس کے مشہور افسر مسٹر اے سی مکر جی کی یادداشت کے مطابق، ہندوستان کے یومِ آزادی کی پہلی سالگرہ کے دوسرے دن، یعنی ۱۶ر اگست ۱۹۴۸ء کو نیو انڈیا انشورنس کمپنی میں ملازمت کر لی۔ مسٹر مکر جی سے میری پرانی ملاقات تھی، اس وقت سے جب وہ نیو انڈیا کے مینیجنگ ڈائریکٹر اور چیئر مین تھے، اور ریٹائرمنٹ کے بعد سے ہندوستان میں ٹوکیو میرین انشورنس کمپنی کی نمائندگی کر رہے تھے۔ جب میں کلکتے گیا تھا تو میں نے ان کو تلاش کیا تھا اس لیے کہ مجھے نیو انڈیا کے مقتدر افسران سے ان کے پرانے مراسم کا علم تھا۔

مسٹر مکر جی سے میری ملاقات تاج بنگال ہوٹل کے خوب صورت لاؤنج میں ہوئی اور انھوں نے بتایا، ''نواب اور میں پندرہ برس تک ایک دوسرے سے قریب رہے تھے۔ ہم دونوں ایک ہی طرح سوچتے تھے، باوجود اس کے کہ جغرافیائی اعتبار سے ہم مختلف علاقوں ہی میں نہیں

مختلف ممالک میں اپنے فرائض انجام دے رہے تھے۔ ہماری قربت اس وقت سے تھی جب ہم دونوں نے ایک ساتھ ہی انشورنس کے شعبے میں اپنا پیشہ ورانہ سفر شروع کیا تھا۔ ہم دونوں نے ایک ہی دن، ۱۶راگست ۱۹۴۸ء، ملازمت شروع کی تھی۔ ہم YMCA میں ایک ہی کمرے میں مقیم تھے اور ساتھ ہی کھانا بھی کھاتے تھے۔ نواب شادی شدہ تھا اور ایک بچے کا باپ تھا۔ اس کی بیوی خوب صورت کاغذ میں لپٹے مٹھائیوں اور سینڈ وچ کے محبت بھرے تحفے بھیجا کرتی تھی۔ اور واقعی ہم دونوں ان سے محظوظ ہوا کرتے تھے۔ نواب کی اپنے چچا سے والہانہ محبت اور وفاداری پر میں اکثر بہت حیران ہوا کرتا تھا۔ وہ ہمیشہ ان کی باتیں کرتا تھا اور ان کی شکر گزاری کرتا تھا اس لیے کہ انھوں نے کتنی محبت سے اس کی پرورش کی تھی۔ نواب نے بتایا کہ جب ہندوستان کا بٹوارہ ہوا تو اس کے چچا بہت پریشان تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ، نواب سمیت، ان کی اولاد ہندوستان سے ہجرت کرے۔ اور انھوں نے حتی الامکان اپنے خاندان کے تمام افراد کو اس ہی ملک میں رہنے کی تلقین کی جہاں وہ پیدا ہوئے تھے۔ مگر حیرت کی بات تھی کہ اس کے چچا کی تمام اولاد پاکستان ہجرت کرگئی اور صرف نواب ہندوستان میں رہ گیا تھا۔ نواب ہمیشہ یہی کہتا تھا کہ اس کے نزدیک چچا سے اس کی وفاداری زیادہ اہم تھی اور اگر اس کے چچا کی خواہش ہے تو وہ ہندوستان ہی میں مقیم رہے گا اور وہیں قسمت آزمائی کرتا رہے گا۔ بہر حال، ہم دونوں نے ایک ہی دن نیو انڈیا انشورنس کمپنی کے صدر درفتر سے ملازمت کا آغاز کیا تھا۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد میں رجمنٹ ٹریننگ اسکیم سے فارغ التحصیل ہو کر نکلنے والا ہمارا جتھا پہلا تھا۔ ہمارا انتخاب پورے ہندوستان سے درخواست دینے والے پندرہ ہزار افراد میں سے ہوا تھا۔ گویا انڈین سول سروس میں منتخب ہونے والوں سے زیادہ مشکل ہمارا انتخاب تھا۔ اور دل چسپ بات یہ ہے کہ ہمارے جتھے کے دس کے دس افراد پیشے کی ممتاز سطحوں پر پہنچے۔ ہم میں سے تین ہندوستان کی مختلف کمپنیوں یا کارپوریشن کے چیئرمین کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ نواب حسن پاکستان میں ای ایف یو کے صدر بنے۔ ہمارا ایک ساتھی ایک بڑے بینک کا سربراہ بنا اور ایک نے بین الاقوامی ری انشورنس کے شعبے میں نام پیدا کیا۔ ایک ہانگ کانگ میں کامیاب بروکر بنا۔ بقیہ تین اسی کمپنی میں جنرل منیجر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے اور آپ جانتے ہیں کہ یہ چیئرمین کے بعد سب سے بڑا عہدہ ہوا کرتا تھا۔ یہ لوگ شاید اس لیے زیادہ اوپر نہ پہنچ سکے کہ جب وہ ہمارے ساتھ منتخب ہوئے تھے تو ان کی عمریں ہم سے زیادہ تھیں اس لیے کہ وہ پہلے دوسرے اداروں میں کام کر چکے تھے۔ میں یہ سب تفصیلات یہ بتانے کے لیے بیان کر رہا ہوں کہ آپ کی کمپنی میں شامل ہونے سے قبل نواب حسن کی پیشہ ورانہ نشوونما ایک اچھے ماحول میں ہوئی تھی۔ اس کے تمام ساتھی دل چسپ لوگ تھے اور ہم سب نرم گرم جھیلے ہوئے تھے۔ چوں کہ ہمارے گروپ کی بڑی تعریف و توصیف ہوتی تھی اور ہمیں ممتاز شخصیات سمجھا جاتا تھا اس لیے ہم سے حسد کیا جاتا تھا، ہم پر طنز ہوتے تھے اور پریشان بھی کیا جاتا تھا۔ مسٹر بی کے شاہ ان تمام باتوں کے ہونے سے قبل ہی محتاط تھے۔ انھوں نے جب پہلے دن ہمیں لیکچر دیا تھا تو خود بڑے واشگاف الفاظ میں ان باتوں کی نشان دہی کی تھی۔ انھوں نے کہا تھا کہ چوں کہ ہم لوگ مراعات یافتہ لوگوں میں سے ہوں گے اس لیے ہمیں اس کا اظہار نہیں کرنا چاہیے۔ انکسار ہماری پہلی ترجیح ہونی چاہیے۔ آپ کو اس کی پوری کوشش کرنی ہوگی تا کہ آپ لوگ عام ملازمین میں ضم ہو جائیں۔ آپ ان کے ساتھ مل کر کام کریں گے تو وہ آپ سے محبت سے پیش آئیں گے۔ اور وہ آپ کو اس لیے احترام کی نظر سے دیکھیں گے کہ آپ عہدوں پر اپنی صلاحیتوں کی بنا پر پہنچے ہیں۔ اور آپ کو ان کا پورا تعاون حاصل ہوگا۔ واقعتاً یہ بڑے حکیمانہ الفاظ تھے۔ اگر آپ اس وقت کے حالات پر غور کریں تو یہ سب کچھ انقلابی معلوم ہوتا تھا۔ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان دنوں 'بڑا صاحب' کا تصور عام تھا اور انھوں نے بار بار ان دقیانوسی خیالات کو تج دینے کی تلقین کی اور مشورہ دیا کہ سب کو آزادی سے اس طرح گھل مل جانا چاہیے جیسے کہ سب ایک جیسے ہوں۔ وہ بہت دل چسپ دن تھے، ہم اور نواب دونوں ایک ایک دن سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ تربیت کے دوران سکھائے جانے والے گر ہمیں نئے نئے چیلنج سے مسابقت میں مدد کرتے تھے۔ یہ اچھے دن تقریباً ڈیڑھ برس تک رہے۔ پھر ہم جغرافیائی اعتبار سے علیحدہ ہو گئے۔ مجھے سیلون انشورنس کمپنی میں متعین کر دیا گیا جہاں سے مجھے تربیت کے لیے میونخ، جرمنی بھیج دیا گیا۔ وہاں میں نے کافی عرصہ آپ کی

کمپنی اور اَلیانز میں گزارا۔ نواب کا تبادلہ ڈھاکا کردیا گیا جہاں اس نے اپنی پیشہ ورانہ تعلیم شروع کی اور چارٹرڈ انشورنس انسٹی ٹیوٹ کے امتحانات میں کامیابی حاصل کرلی۔ اور جیسا کہ میری تقدیر میں لکھا تھا، جرمنی سے واپسی پر مجھے اپنی کمپنی کا کاروبار سنبھالنے کے لیے کلکتے میں تعینات کردیا گیا۔ اس طرح میں اور نواب جغرافیائی اعتبار سے پھر قریب آ گئے اور ہمیں جب بھی کوئی مسئلہ درپیش ہوتا تو ایک دوسرے سے مشورہ کرتے۔ ہم دونوں کے لیے یہ ایک دل چسپ دور تھا۔‘‘

نواب حسن کے لیے ۱۹۵۸ء ایک اہم سال تھا۔ کراچی میں نیو انڈیا کے منیجر ریٹائر ہونے والے تھے اور نواب حسن کو یہ مشکل کام عارضی طور پر سونپا گیا تھا۔ مشکل اس لیے کہ اس عہدے پر رہنے والے کا قیام اگر چہ بمبئی میں ہوتا تھا مگر اس کو بمبئی اور کراچی کے درمیان بار بار آنا جانا ہوتا تھا اور اس سفر کی مشکلات اور تکالیف سے ہم سب واقف ہیں۔ نواب حسن کے لیے اس میں خیر کا پہلو یہ تھا کہ اس طرح انھیں اپنے خاندان کے زیادہ تر افراد سے، ان سے بھی جو پاکستان ہجرت کرکے کراچی میں آباد ہوگئے تھے، ملنے جلنے کے مواقع ملتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ اس تعیناتی نے نواب حسن کے ای ایف یو میں شامل ہونے اور پاکستانی قومیت حاصل کرنے میں فیصلہ کن کردار ادا کیا تھا۔

نواب حسن ان دنوں بمبئی ہی میں تھے جب ہماری ان کی ۱۹۶۴ء کے موسم بہار میں ملاقات ہوئی تھی۔ مگر نیو انڈیا انشورنس کے کارِ منصبی کی بجا آوری کے لیے انھیں ایران، عراق، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ بھی جانا ہوتا تھا۔

مسٹر مکرجی نے بتایا کہ ’’جب ای ایف یو نے سلسلہ جنبانی کی اور آپ کا اور مسٹر بھیم جی کا بمبئی آنا ہوا تو نواب نے فوراً مجھ سے رابطہ قائم کیا اور رازدارانہ انداز میں مجھے بتایا کہ اس نے پاکستان ہجرت کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ اس اطلاع سے مجھے دھچکا سا لگا تھا۔ اس لیے کہ ایک تو ہم دوسرے اتنے قریبی دوست رہے تھے دوسرے یہ کہ اب تک جو کچھ اس نے مجھ سے کہا تھا، اس کے پیشِ نظر میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ اس ملک کو چھوڑنے کے بارے میں سوچ سکتا ہے۔ اس نے دورانِ گفتگو بارہا یہ کہا تھا کہ اپنے چچا سے محبت اور احترام کے پیشِ نظر وہ اس ملک میں رہ کر خوش تھا۔ مگر اس نے یہ بھی کہا اس کے زیادہ تر رشتے دار پاکستان میں بس گئے ہیں اور خوش ہیں۔ اس نے یہ بھی کہا کہ اگر چہ وہ ہندوستان میں اپنی ملازمت اور ترقی کے ممکنہ مواقع سے بھی مطمئن ہے مگر اس کو اپنے بچوں کے مستقبل کے بارے میں بھی سوچنا ہے۔ میں نے اس کے خیالات سے اتفاق کیا مگر جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، مجھے اس بات سے دھچکا ضرور لگا تھا۔ مگر سچ تو یہ تھا کہ اس زمانے میں فسادات بھی ہو رہے تھے اور شاید ان حالات کے پیشِ نظر ہی وہ اس فیصلے پر پہنچا ہوگا۔ میں نے اس کے فیصلے پر سرخم کردیا اور یہ جانتے ہوئے کہ پاکستانی مارکٹ میں ایسٹرن فیڈرل یونین کا بڑا نام تھا، ساتھ ہی یہ بھی کہ آپ کی کمپنی سے بھی اس ادارے کے قریبی تعلقات تھے۔ مجھے یقین تھا کہ پیشہ ورانہ نقطۂ نظر سے نواب حسن صحیح فیصلہ کر رہا تھا۔ ہم دونوں نے یہ عہد و پیماں کیے کہ ہم اگر چہ جغرافیائی طور پر الگ ہو رہے ہیں مگر ہمیشہ ایک دوسرے سے رابطے میں رہیں گے، یہ جانتے ہوئے کہ دونوں ملک کے اربابِ اقتدار بھلا کس حد تک ہم دونوں کو بار بار ملنے کے مواقع فراہم کرنے کی اجازت دیں گے۔‘‘

میں مسٹر مکرجی کے خیالات سے، اور جس انداز میں انھوں نے اپنے دوست کا تذکرہ کیا تھا، بہت متاثر ہوا تھا۔ ان سے مل کر مجھے اس انسان کے اندرونی معاملات سے آگہی کے مواقع ملے تھے جس کی بنا پر ہم بھی اس کی ذاتی اور کاروباری زندگی سے متاثر ہوئے اور کراچی منتقل ہونے کے فیصلے کے بعد میں نے اس کے نئے مستقبل پر ہمیشہ نگاہ رکھی تھی۔

نواب حسن اس شہر میں باقاعدہ آن بسے جو ان کے لیے اجنبی نہیں رہ گیا تھا۔ انھیں اس ماحول میں جذب ہونے میں کوئی دقت نہیں پیش آئی۔ یہاں بسے ہوئے رشتے دار بھی اس تبدیلی میں ان کے معاون ہوئے تھے۔ اور شاید یہ بتانا کچھ ضروری نہیں کہ ہم لوگوں نے بھی ان کی مدد میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ ہم دونوں نے یہ طے کرلیا تھا کہ تقریباً چھ ماہ تک ہم، ایک ہی میز پر آمنے سامنے بیٹھیں گے اور دونوں مل کر سارے فیصلے کریں گے۔ بہت جلد ہی ہم ایک بے مثال ٹیم بن گئے اور دو سے تین ماہ کے اندر ہی ہمیں اندازہ ہوگیا کہ اتنا ہی

بہت ہے۔ میں نے چیف ایگزیکٹیو سے کہا کہ اب مزید کوئی ضرورت نہیں کہ ہم ایک ہی کام کو دوبارکریں اور اب نواب حسن کو کام پر اکیلے لگا دیا جائے، جس سے انھوں نے بہ خوشی اتفاق کیا۔ ہم دونوں کو ایک ساتھ کام کرنے میں بہت مزہ آیا تھا اور نواب اس بات سے انکار نہیں کر سکتے کہ ایسے بہت سے مواقع آئے جب ہم نے ایک دوسرے سے سیکھا تھا۔ ہم دونوں کے درمیان اور ہماری دونوں کمپنیوں کے درمیان بھی تبادلۂ تجربات ہوتا رہا جس سے میونخ ری نے بھی فائدہ اٹھایا۔ نواب کے گہرے پیشہ وراحساس اور ان کی تہذیبِ کار نے مجھے بہت متاثر کیا جس کی وجہ سے ہم دونوں میں ایک ایسا جذبۂ احترام پیدا ہوگیا تھا کہ میرے پاکستان اور ای ایف یو کو چھوڑنے کے بعد بھی یہ رشتہ مضبوطی سے قائم رہا۔ مجھے نواب کی خاموش طبعی سے کام کے مسائل کو سلجھانے کا انداز بہت اچھا لگتا تھا۔ حالاں کہ وہ ایک خود بین وخود پسند انسان تھے مگر اپنی پیشہ ورانہ ذمے داریوں سے ان کا جذباتی لگاؤ ان کی شخصیت پر چڑھی ہوئی خاموش طبعی کی 'جادوئی ٹوپی' کے باوجود جھانکنے والوں کو صاف دکھائی دیتا تھا۔ نواب حسن ایک کامل مہذب انسان تھے جن کا احترام ان کے حریفِ کار بھی کرتے تھے۔ بہت جلد ہی نواب حسن انشورنس کے تمام تکنیکی معاملات میں مقتدر مانے جانے لگے۔ وہ انشورنس ایسوسی ایشن آف پاکستان کی فائر کمیٹی کے چیئرمین اور مرکزی کمیٹی کے رُکن منتخب کر لیے گئے۔ یہ ادارے برسوں سے بیمے کی صنعت میں سب سے اہم حیثیت رکھتے تھے۔ ۱۹۷۰ء میں ایس ایم معین الدین کی وفات، اور بالخصوص ۱۹۷۶ء میں زندگی کے بیمے کی صنعت کو قومی ملکیت میں لیے جانے کے بعد، مسٹر بھیم جی کے علاوہ نواب حسن سب سے بارسوخ شخصیت ہو گئے تھے۔ ۱۹۷۳ء میں انھیں کمپنی کا صدر بنا دیا گیا اور کمپنی کے 'تین بندوق برداروں' (Three Musketeers) میں سے 'پہلے بندوق بردار' بن گئے جنھوں نے مسٹر بھیم جی کی خود ساختہ جلاوطنی کے دوران ای ایف یو کا کاروبار چلایا تھا۔

اس کے بعد پاکستان، سعودی عرب اور انگلستان میں بہت مصروف سال گزرے۔ نواب حسن کمپنی کے صدر بنے اور بعد میں تکنیکی مشیر کی حیثیت میں انھوں مسٹر عظیم رحیم کی معاونت کی جو 'دوسرے بندوق بردار' بن چکے تھے۔ ۱۹۸۰ء میں مسٹر سلطان احمد نے کمپنی کی باگ ڈور سنبھال لی تھی۔ نواب حسن کہیں بھی رہے ہوں، خواہ وہ سعودی عرب میں کریڈٹ اینڈ کامرس انشورنس کمپنی کے مینجنگ ڈائریکٹر یا لندن میں ہولڈنگ کمپنی کے ڈائریکٹر، وہ کسی نہ کسی صورت میں اس ادارے سے منسلک ہی رہے۔ اور ہم دونوں ایک دوسرے سے ہمیشہ رابطے میں رہے خواہ وہ کاروباری سلسلے میں ہو یا ذاتی۔ نئے گروپ کو بھی ان کے تکنیکی پیشہ وارنہ مشوروں کی ضرورت رہی۔ بدقسمتی سے ان کی صحت خراب ہونے لگی اور ایسا لگا کہ اب وہ ملازمتی ذمے داریوں کا بوجھ اٹھانے کے قابل نہیں رہے تھے۔ بالآخر ۱۹۸۹ء میں وہ ملازمتی ذمے داریوں سے مکمل طور پر کنارہ کش ہوگئے اور اپنا باقی ماندہ وقت اپنے اہلِ خاندان کے ساتھ گزارنے لگے تھے۔ ہمارے سلسلے اب ٹیلی فون پر بات چیت تک محدود ہو کر رہ گئے تھے۔ اس کے بعد ہمیں ملاقات کا موقع نہیں ملا۔

جب ہم اپنے دوست کے بارے میں بات کر رہے تھے جن کا اچانک ۱۹۹۴ء میں انتقال ہوگیا تھا تو مسٹر مکر جی نے کہا، ''ہاں نواب حسن بہت خود بیں آدمی تھے۔ اور شاید یہی وجہ تھی کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھتے بھی تھے اور پسند بھی کرتے تھے۔ میں بھی ذہنی طور پر نواب حسن جیسا ہی انسان ہوں، اگر چہ میں لوگوں سے میل جول رکھتا ہوں۔ گویا ہم دونوں ایک دوسرے سے بہت ملتے تھے۔ ہم دونوں خود بیں ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے بہت کھلے ذہن سے ملتے تھے اور بغیر کسی تکلف کے بہت ساری ذاتی باتیں کرتے تھے۔ وہ لیے دیے رہنے والے انسان نظر آتے تھے مگر اچھے دوست اور اچھے انسان تھے۔ بہت افسوس کی بات ہے کہ نواب حسن نسبتاً کم عمری میں انتقال کر گئے۔ ان کی ریٹائرمنٹ کے بعد جب ہماری کراچی میں ملاقات ہوئی تو ان سے مل کر میں بہت افسردہ ہوا تھا۔ انھوں نے اپنے اندرونی خول میں واپس جانا شروع کر دیا تھا۔ انھوں نے ڈارھی بڑھانی شروع کردی تھی اور میرے پوچھنے پر کہا تھا، ''نہیں میں اب کوئی کام نہیں کرتا۔'' وہ بہت مذہبی آدمی ہو گئے تھے، اگر چہ وہ ایسے نہیں تھے۔ انھوں نے بار بار مجھ سے کہا تھا، ''اپنے اطراف مجھے مسئلے ہی مسئلے نظر آتے ہیں، اور ان سے نمٹنے کا یہی ایک طریقہ ہے۔ لہٰذا اس نے اپنے آپ کو ایک مختلف ذہنی کیفیت میں ڈھال لیا تھا جس کہ وجہ سے ان کی

وہ شخصیت باقی نہیں رہی تھی، میں جسے اتنے برسوں سے اتنے قریب سے جانتا تھا۔"

نواب حسن بہت نظم و ضبط کے آدمی تھی اور انھیں اپنے اوپر بہت قابو بھی تھا۔ میں نے ان کو غصے میں کبھی نہیں دیکھا۔ جیسا کہ ان کے انتقال پر تعزیت میں انشورنس جرنل نے لکھا تھا، "فطرتی طور پر وہ خاموش طبع اور شریف انسان تھے۔" ان لوگوں سے جن سے ان کا مزاج اور ذہنی سطح ملتی تھی، باتیں کرنے میں انہیں بہت لطف آتا تھا۔ وہ مذاق بھی کرتے تھے بشرطیکہ اس میں بھی کوئی عقلی پہلو ہو۔ وہ ٹھٹھا مار کبھی نہیں ہنستے تھے، بس ایک دل آویز مسکراہٹ ان کی خوشی کا سب سے بڑا اظہار ہوتی تھی۔ میں نے ہمیشہ ان کو ایسے "سفید فام اشرافیہ کے ایک فرد" سے تعبیر کیا ہے جو اپنے تمامتر دوستانہ جذبے کے ساتھ اچانک منظر پر نمودار ہوتا ہے اور بغیر کسی ذاتی منفعت کے امداد کی پیش کش کرتا ہے۔ انھوں نے کبھی کسی کو جان بوجھ کر نقصان نہیں پہنچایا۔ ان کی زندگی کی مختلف اختیار کردہ راہوں میں آپ کو کوئی بھی گھائل پڑا ہوا نظر نہیں آئے گا۔

اور جس طرح وہ اچانک آئے تھے، اپنی عادت کے مطابق، جہاں انھیں جانا تھا خاموشی سے چلے گئے۔ میں اور میری اہلیہ نواب حسن کے انتقال کے پانچ برس بعد مسز حسن سے ملاقات کے لیے گئے تو انھوں نے بتایا کہ یہ سب کس طرح ہوا۔ نواب حسن علی الصبح اٹھنے کے عادی تھے۔ نماز سے فراغت کے بعد روزانہ وہ سیر کے لیے نکل جاتے۔ اس آخری صبح انھوں نے وہ کچھ کیا جو وہ کبھی نہیں کرتے تھے۔ اٹھنے کے بعد اپنی بیوی کو بھی اٹھایا اور کہا، "اب تمھیں ہر بات کے لیے تیار ہو جانا چاہیے۔ میں نے سب کچھ اس طرح کر دیا ہے کہ گھر اسی طرح چلتا رہے گا۔ اور پھر انھوں نے اپنا سب سے اچھا سوٹ نکال کر بستر پر رکھ دیا۔ جب ان کی بیوی نے ان سے پوچھا کہ کیا ان کو کسی جلسے میں جانا ہے تو انھوں نے کہا کہ وہ حسبِ معمول صبح کی سیر کو جا رہے ہیں اور واپس آ کر لباس تبدیل کریں گے اور بعد میں کہیں جائیں گے۔ مسز حسن کو بہت عجیب سا لگا۔ وہ کہتی ہیں کہ "وہ بہت پُرسکون تھے مگر عجیب سے لگ رہے تھے،" انھوں نے خدا حافظ کہا جو وہ سیر پر جانے سے قبل کبھی نہیں کہتے تھے۔ اور پھر وہ باہر چلے گئے۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد کسی نے دروازے پر دستک دی اور پوچھا کہ کیا جو صاحب ابھی سیر کو باہر گئے ہیں۔ وہ آپ کے شوہر تھے۔ ان کی اہلیہ نے کہا، جی ہاں، یقیناً۔ مگر اس وقت وہاں اور لوگ بھی جمع تھے جو ان کو اٹھا کر گھر کے اندر لائے۔ وہ انتقال کر چکے تھے۔ چند دقیقوں کے اندر ہی ان کا انتقال ہو گیا ہوگا۔ ان کا چہرہ بالکل پُرسکون تھا، کسی درد یا تکلیف کے آثار نہیں تھے۔

اُس دن نواب حسن آخری بار گھر آئے تھے۔

ای ایف یو کے مینجنگ ڈائریکٹر، ۱۹۷۸ء، عظیم رحیم

روشن علی بھیم جی اور ای ایف یو کے ڈائریکٹر کا ۱۹۶۷ء کے لائف کنونشن کے موقع پر ڈھاکا ایئر پورٹ پر استقبال مشرقی پاکستان میں ای ایف یو کے منیجر عظیم رحیم اور حکومتِ پاکستان کے سابق سیکرٹری ایم یو احمد بھی تصویر میں نمایاں ہیں

عظیم رحیم

بنگالی طرزِ شرافت

انھوں نے ایک بار مجھ سے کہا تھا کہ ''زندگی ایک کھیل کی طرح ہوتی ہے۔ اس میں جیت بھی ہوتی اور ہار بھی۔ میں نے شروع ہی سے جیتنے والوں کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔''

عظیم رحیم سے میری پہلی ملاقات ستمبر ۱۹۶۰ء میں ہوئی۔ میرے پیش رو مسٹر شوارز جرمنی واپس جا چکے تھے اور کمپنی کے جنرل منیجر اور موئسس مسٹر حیدر پاکستان انشورنس کارپوریشن کے منیجنگ ڈائریکٹر ہو گئے تھے۔ کمپنی میں ایک قسم کا خلا پیدا ہو چکا تھا۔ اسی دوران میں نے ملک کے مشرقی بازو کا دورہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ ڈھاکا جانے والی پی آئی اے کی بوئنگ ۷۰۷ کی چھ گھنٹے کی طویل پرواز موسم کی خرابی کی وجہ سے تاخیر سے پہنچی۔ مشرقی پاکستان کے دارالحکومت پر موسلا دھار بارش ہو چکی تھی۔ مشرقی پاکستان میں ایسٹرن فیڈرل یونین کے چیف عظیم رحیم نے مجھے لینے کے لیے اپنے ڈرائیور کو اس پیغام کے ساتھ ہوائی اڈّے بھیجا تھا کہ وہ جیم خانہ کلب میں میرے منتظر ہوں گے۔ ہوائی اڈّے سے جیم خانہ پہنچنے میں بہت وقت لگا اس لیے کہ کچھ سڑکوں پر پانی جمع ہوگیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ رکشے والوں کے جھنڈ اپنی سواریوں کو پانی سے خشکی پر لے جانے میں مصروف تھے۔ کلب کے دروازے پر بھی پانی بھرا ہوا تھا۔ کچھ پتھروں پر رکھے ہوئے تختوں کی مدد سے بہ مشکل تمام میں اندر پہنچا تو مجھے بتایا گیا کہ عظیم رحیم صاحب لابی میں میرے منتظر ہیں۔ میرے منتظر ساتھی ایک کھلے ہوئے برآمدے میں تشریف فرما تھے اور ان کے اطراف بہت سے دوست بظاہر کسی اہم معاملے پر بحث میں مشغول تھے۔ عظیم رحیم صاحب نے بعد میں مجھے بتایا تھا کہ یہ کوئی اہم بحث نہیں، بس یوں ہی دوستانہ گپ شپ تھی۔ انھوں نے مجھے دوستوں سے متعارف کیا اور میرا ہاتھ پکڑ کر نسبتاً ایک پُرسکون گوشے کی طرف لے گئے۔ کراچی جیم خانہ اور سندھ کلب کے مقابلے میں، ہم جس کے عادی تھے، اس جگہ زیادہ بھیڑ تھی مگر یہاں کا ماحول غیر رسمی سا تھا۔ مجھے فوراً اندازہ ہوگیا کہ میرے مقامی ساتھی یہاں موجود لوگوں سے کافی گھلے ملے ہوئے تھے۔

عظیم رحیم خاصے دراز قد اور خوش لباس آدمی تھے۔ وہ ٹائی باندھے ہوئے تھے جو یہاں کے ماحول میں عام نہیں تھی۔ ان سے بات کرتے ہی مجھے محسوس ہوگیا کہ وہ بہت نرم گفتار انسان تھے جن سے بہت آرام سے بات کی جاسکتی تھی۔ انھوں نے جس انداز میں مجھے خوش آمدید کہا اس میں خلوص جھلکتا تھا، ان کا انداز دوستانہ تھا اور اور وہ کھلے ذہن کے آدمی معلوم ہوتے تھے۔ میں نے سوچا کہ یہ کام کے آدمی ہیں اور آج جب میں چالیس برس پہلے کی ملاقات کو یاد کرتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ ان کا یہ انداز ہی ہمارے درمیان مستقبل میں کاروباری رشتہ استوار کرنے کی بنیاد بنا تھا۔

عظیم رحیم ۱۹۱۹ء میں کلکتے میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ نہایت روانی سے بنگالی بولتے تھے۔ بہت ہی کم لوگوں کو معلوم تھا کہ ان کا خاندان سندھی تھا۔ غالباً انیسویں صدی کی ابتدا ہی میں ان کا خاندان کچھ (Kutch) ہجرت کر گیا تھا۔ جس جگہ وہ آباد ہوئے اس کو بدری

کہا جاتا تھا۔ ان کے والد تین یا چار بھائی تھے۔ ان سب نے دنیا کے مختلف علاقوں میں قسمت آزمائی کا فیصلہ کیا تھا۔ ایک مشرقی افریقا چلا گیا، دوسرا کلکتے میں آباد ہو گیا اور ایک یا دو گجھ ہی میں رہ گئے تھے۔ جیسا کہ ہندوستانی خاندانوں میں ہوتا ہے، ایک گھرانے کے جانے کے بعد دوسرے گھرانے والے بھی پہنچ جاتے، آپس میں کاروبار کرنے لگتے اور تاجر بن جاتے۔ عظیم رحیم کے والد کلکتے میں بس گئے تھے اور انیسویں صدی کے آخر میں انھوں نے بنیان بنانے کا کارخانہ لگا لیا، ان کے تمام اہلِ خانہ جس سے کسی نہ کسی طور پر منسلک تھے۔ ان سب کا کاروبار اچھا خاصا چل گیا تھا۔ عظیم رحیم کے والد نے تین شادیاں کی تھیں جن سے بارہ بچے پیدا ہوئے۔ عظیم رحیم ان ہی میں سے ایک تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم اینگلو گجراتی اسکول میں ہوئی جس کے بعد وہ کلکتے کے سینٹ زیویر اسکول اور کالج میں پڑھتے رہے تھے۔ مگر جلد ہی تقریباً پورے ہندوستان میں فرقہ وارانہ تناؤ کی کیفیت پیدا ہوگئی اور مسلمانوں کا کاروبار مندا پڑ گیا۔ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، عظیم رحیم ہمیشہ جیتنے والے گروہ میں ہونا پسند کرتے تھے، اس لیے انھوں نے بنیان کے کاروبار کو خیر باد کہا اور دوسرے امکانات کی تلاش میں لگ گئے۔ عظیم رحیم کے خاندان کے دوست یوسف خالد بیٹھا نے، جو بمبئی میں نئی ساختہ حبیب انشورنس کمپنی کے مینجنگ ڈائریکٹر تھے، ان کو انشورنس کے کاروبار میں قسمت آزمائی کا مشورہ دیا جو انھوں نے قبول کر لیا۔ عظیم رحیم نے پہلے برٹش انڈیا انشورنس کمپنی کے کلکتے کے دفتر میں ۱۹۴۵ء میں کام شروع کیا۔ تقسیم ہند کے بعد بیٹھا صاحب نے عظیم رحیم کو ایسٹرن فیڈرل اور ایک اور کمپنی کے مشترکہ دفتر میں حبیب انشورنس کمپنی کا نمائندہ مقرر کر دیا۔ حسبِ معمول عظیم رحیم نے جیتنے والے گروہ کی تلاش میں ایسٹرن فیڈرل یونین میں شرکت کر لی۔ پہلے وہ چاٹگام میں اور پھر ڈھاکے کی شاخ کے منیجر بنا دیے گئے۔ بعد میں وہ پورے مشرقی پاکستان کے منیجر ہو گئے اور کمپنی نے ان کا عہدہ بڑھا کر ان کو سینئر ایگزیکٹیو وائس پریزیڈنٹ بنا دیا۔

عظیم رحیم گفتگو میں مہارت رکھتے تھے۔ ان کے بیٹے علی رحیم نے بتایا کہ ''میں ہمیشہ دیکھتا تھا کہ صبح ہوتے ہی وہ کسی نہ کسی سے ٹیلی فون پر گفتگو شروع کر دیتے تھے۔ مجھے خبر نہیں کہ کس سے مگر صبح آٹھ بجے سے ہی یہ سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ ہر روز وہ مختلف گاہکوں سے مصروفِ گفتگو ہوتے۔ میرا خیال ہے کہ ان کی کوشش ہوتی تھی کہ اپنے گاہکوں سے ان کے مضبوط رشتے قائم رہیں۔ بچپن ہی سے میں اپنے والد کو ایک ہیڈ ماسٹر کی مانند سمجھتا تھا۔ وہ لوگوں کو برابر وہ کام کرنے پر راضی کرنے کی کوشش کرتے جو ان کے نزدیک ان لوگوں کے لیے بہتر ہوتا، بالکل کسی اسکول کے ماسٹر کی طرح۔ جب بھی میں ان کے دفتر جاتا تو ان کو بڑی سی میز پر کاغذ پنسل پھیلائے دستخط کرتے دیکھتا تھا۔''

مشرقی پاکستان میں ای ایف یو کے جنرل ڈپارٹمنٹ کے کاروباری سربراہ کی حیثیت سے عظیم رحیم نے ہمیشہ اس بات کی کوشش کی تھی کہ ان کی 'سلطنت' اتنی مضبوط ہو کہ کراچی میں بیٹھے ہوئے افسران کو ان کے معاملات میں دخل اندازی کا موقع نہ مل سکے۔ عظیم رحیم مشرقی پاکستان کے سیاسی دھارے کے جذبات کی مدد سے کلیم دلوانے کے لیے اپنے پتّے بڑی ہنرمندی سے کھیلنا جانتے تھے۔ اگرچہ وہ پیدائشی پکّے بنگالی تھے مگر انھوں نے کبھی سیاسی جذبات کی لہروں کے بل پر اپنی پوزیشن مضبوط کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ بہت بارسوخ دوست اور ہنرمند گرو رکھتے تھے، اور جب بھی ضرورت پڑتی ان کے مضبوط بازوؤں کی مدد سے اپنا مقصود حاصل کر لیتے۔ ۱۹۶۰ء تک انھوں نے اصفہانی خاندان سے اچھے تعلقات استوار کر رکھے تھے، مشرقی پاکستان میں جن کے سارے کاروبار کا بیمہ ایسٹرن فیڈرل ہی کے پاس تھا۔ آدمجی خاندان سے بھی ان کے بہت اچھے تعلقات تھے جو ان دنوں مشرقی پاکستان کے بڑے صنعتکاروں میں سے ایک تھے۔ ڈھاکے کے کاروباری حلقے میں عظیم رحیم بہت مقبول تھے اور اس طرح کمپنی کے لیے وہ ایک بڑا اثاثہ تھے۔ جس طرح ہندوستان میں برطانوی راج کے تسلط کے خلاف جدوجہد جاری تھی کچھ اسی طرح کمپنی کے صدر دفتر اور شاخوں کے درمیان رسّہ کشی کی ایک کیفیت تھی جس کو ہم وسیع معنوں میں بنگال کی مسلم قومیت اور کراچی (اور بعد میں اسلام آباد) کے مرکزِ اقتدار کے درمیان کھینچا تانی کے مماثل قرار دے سکتے ہیں۔ ملک کے مشرقی بازو کے عام اور مخصوص حالات اور کیفیات کا پورا ادراک کیے بغیر کمپنی کے صدر دفتر کو مکمل مرکزِ اقتدار بنانا، غیر ارادی طور پر، شاید کمپنی نے بھی برطانوی راج کے طریقۂ کار ہی سے سیکھا تھا۔ اگر آپ بنگال کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو آپ کو نہایت سخت گیر قوم پرست طبقہ نظر آئے گا

جو وقتی طور پر تحریکِ پاکستان کے ہراول دستے میں شامل ہوگیا تھا۔ تاریخ کے بیشتر طالب علم اس بات کے قائل ہو چکے ہیں کہ ۱۶/دسمبر ۱۹۷۱ء کو بنگلہ دیش کے قیام کے بعد ہونے والے واقعات بنگالی قوم پرست طبقے کی اسی جد و جہد کا شاخسانہ بن کر اُبھرے تھے۔

میں یہ نہیں کہنا چاہ رہا ہوں کہ عظیم رحیم کمپنی میں اپنی ایک آزاد سلطنت بنانے میں بنگالی سیاست پر عمل کر رہے تھے۔ بظاہر اس قسم کی سیاست اس لیے ضروری نہیں تھی کہ کمپنی کے دونوں چیف ایگزیکٹیو، جن کی ماتحتی میں وہ کام کر چکے تھے، جناب عبدالرحمٰن صدیقی اور جناب کے ایف حیدر خود نہ صرف بنگالی النسل تھے بلکہ ملک کے مقدر لوگوں سے ان کے ویسے ہی قریبی تعلقات بھی تھے جیسے کہ مسٹر بھیم جی نے بھی قائم کر رکھے تھے۔ میں دراصل یہ کہنا چاہ رہا ہوں کہ عظیم رحیم جیسا انسان بھی جس کی مشرقی پاکستان کی سماجی اور معاشیاتی زندگی اور حلقۂ اقتدار تک پہنچ تھی، مشرقی اور مغربی بازو کے درمیان چلنے والی زیریں لہروں اور گرم جذبات سے متاثر ہوا ہوگا جن کے نتیجے میں ۱۹۷۱ء کے بدقسمت واقعات رونما ہوئے تھے۔

جی نہیں! عظیم رحیم کسی زاویے اور کسی معنوں میں بھی سیاست داں نہیں تھے۔ تمام تر تکنیکی اڑنگوں کے باوجود وہ ان حقوق کے لیے بڑی بہادری سے لڑتے رہے تھے جو ان کے نزدیک ان کے گاہکوں اور دوستوں کو ملنے چاہییں تھے۔

عظیم رحیم اور ان کے اہلِ خانہ اس وقت کراچی میں مقیم تھے جب مشرقی پاکستان کے حالات خراب ہونا شروع ہوئے تھے اور بالآخر بنگلہ دیش قائم ہوگیا تھا۔ ان کا بیٹا کہتا ہے کہ ''جب مشرقی پاکستان کا زوال ہو تو ہم سب موجودہ حالات کا محاسبہ کر رہے تھے۔ جو کچھ بھی ہمارے پاس تھا تقریباً سب کھو چکا تھا۔ ہم سب اکٹھے تھے جب اچانک میرے والد نے کہا تھا، 'کیا یہ سب سے بڑی نعمت نہیں ہے کہ ہم سب زندہ اور صحیح و سالم ایک ساتھ ہیں۔ آج سے ہم مشرقی پاکستان کو بھول کر نئی ابتدا کریں گے۔ تم سب کو خدا کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ تمھارے باپ کے پاس اس وقت بھی ایک باقاعدہ ملازمت ہے۔ ہم نے جو کچھ بھی کھویا ہے اب ہم اس کی پروا نہیں کریں گے۔' یہ سُن کر واقعی مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ اس لیے کہ جو کچھ ہمارے پاس تھا اس کے لیے انھوں نے بہت جد و جہد کی تھی، انھوں نے ساری زندگی کام کیا تھا۔ اور اب وہ سب کچھ کھو چکے تھے، تمام اثاثہ، اپنا خاندانی سلسلہ، حتیٰ کہ دوست بھی۔ اور اب وہی کہہ رہے تھے کہ فکر نہ کرو ہمیں پھر سے شروعات کرنی ہے۔ چند برس بعد بنگلہ دیش سے میرے ایک بنگالی دوست ہم سے ملنے آئے۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ اگر ہم سب واپس ڈھاکا آجائیں تو، فوراً تو نہیں مگر چند برسوں کے اندر اندر، جو کچھ بھی ہم نے کھویا ہے وہ سب واپس مل جائے گا۔ یہ سن کے میں بہت جذباتی ہوگیا اور میں نے اپنے والد سے اس موضوع پر بات کی۔ وہ بہت پُرسکون رہے اور سر ہلا کر کہا، 'ہم نے جو کچھ کھویا ہے وہ کھو گیا ہے، اس کو بھول جاؤ، اپنے کاروبارِ زندگی میں لگے رہو۔ میں نے وہاں جو کچھ کھویا ہے مجھے اس کی بالکل فکر نہیں نہ مجھے اس کا افسوس ہے۔' میرے والد کی سوچ کا یہی انداز تھا۔ وہ اسی قسم کے انسان تھے جو 'ہمیشہ موجود' کی پروا کرنے والے ہوتے ہیں اور ہر طرح کے چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔'' اس قسم کے انسان کے لیے مختلف ماحول میں اپنے آپ کو ڈھال کر ضم ہو جانا کچھ آسان کام نہیں ہوتا۔ مگر ان کے بیٹے کے مطابق انھوں نے یہ چیلنج قبول کر لیا تھا اور ۱۹۷۳ء میں نواب حسن کے ساتھ اور بعد میں تنِ تنہا ان کو پوری کمپنی کی باگ ڈور سونپ دی گئی، جس کی وہ تیس برسوں سے خدمت کر رہے تھے۔ لوگوں کے مسائل کو بلا کسی تفریق اور غیر رسمی طور پر حل کرنے کی کوشش کی وجہ سے وہ اپنے دوستوں میں ہر دلعزیز ہوگئے تھے۔ کمپنی کی ملازمت کے آخری دن تک وہ اپنے شریفانہ طرز، نرم خوئی اور جذبۂ ہمدردی کی وجہ سے پسند کیے جاتے تھے۔ وہ حتی الوسع کمپنی کے سفینے کو تلاطم سے نکالنے میں کامیاب رہے، جو ان دنوں بڑے طوفانوں کی زد میں تھا۔ مشرقی پاکستان کے زوال کے نتیجے میں آدھے سے زیادہ کاروبار کا ڈوب جانا اور پھر اس کے ایک برس بعد زندگی کے بیمے کا قومی ملکیت میں لیا جانا اور اس کے ساتھ ہی کمپنی کے زیادہ تر اثاثوں کا حکومت میں تحویل میں چلا جانا (جن کی بنا پر یہ ادارہ بڑا ہوا تھا) ایسے سانحے تھے جنھوں نے بڑی مشکلات پیدا کر دی تھیں۔ ساتھ ہی اور بہت سی صنعتوں کو قومی ملکیت میں لیے جانے کی وجہ سے ان تمام اداروں کے بیمے کا کاروبار سرکاری ادارے

نیشنل انشورنس کارپوریشن کی تحویل میں چلا گیا تھا جس سے کمپنی کو اور بھی دھچکا لگا تھا۔ ان سب حالات کے پیشِ نظر مستقبل کی ترقی کے لیے کمپنی کی نئے سرے سے ترتیب اہم اور مشکل بھی ہوگئی تھی۔

روشن علی بھیم جی کی خود ساختہ جلا وطنی کے بعد جو لوگ سامنے آئے اور جنھیں میں نے 'تین بندوق برداروں'' کا نام دیا تھا، عظیم رحیم ان میں سے ایک تھے۔ اور جب ۱۹۸۰ء میں وہ ریٹائر ہوئے تو انشورنس کی صنعت میں انھوں نے جو کچھ بھی کامیابیاں حاصل کی تھیں، ہمیں ان پر فخر تھا۔ جن لوگوں پر کمپنی کی کارکردگی پر نظر رکھنے کے فرائض تھے، وہ ہزاروں میل دور ہوں تو اس قسم کے لوگوں کو کنٹرول کرنا اور بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ مگر ایسے ہی موقعوں پر کسی اچھے کاروباری ادارے کے ایک عام برانچ منیجر اور ایک ریجنل منیجر کا فرق ابھر کر واضح ہوتا ہے۔ جب میں اور وہ دونوں رفیقِ کار تھے، ہمیں کام کرنے کے اصول معلوم تھے اور ہم ان کی حدوں میں رہ کر ہی اپنے فرائض انجام دیتے تھے۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ جب ان کو بڑے اختیارات ملے تب بھی وہ اپنے زرّیں اصولوں ہی پر کاربند رہے تھے۔

کمپنی سے ریٹائر ہونے کے بعد انھوں نے ہر طرح کے کاروبار سے ہاتھ کھینچ لیا تھا اور اپنے سماجی کاموں کی طرف پوری طرح متوجہ ہو گئے تھے۔ انھوں نے خود مجھے بتایا تھا کہ وہ حبیب گروپ کے وقف کی کچھ خدمت کرنا چاہتے تھے۔ مگر پھر ان کے پرانے دوستوں، 'باوانی' اور 'علی شوگر' کے مسٹر زکریا نے مل کر Reliance نام کی ایک جنرل انشورنس کمپنی بنائی اور انھوں نے عظیم رحیم سے اصرار کیا کہ کم از کم شروع دنوں میں ہی وہ اس کی باگ ڈور سنبھال لیں اور انھوں نے بہت حیص بیص کے بعد یہ ذمے داری قبول کر لی۔ اس نئی کمپنی کی تاسیس کے بعد وہ ری انشورنس کے لیے میونخ میں میری ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ بعد میں جب میں کراچی آیا تو ان کے دفتر بھی ملاقات کے لیے گیا تھا۔ یہ صاف ظاہر تھا کہ وہ صرف اپنے دوستوں کی معاونت کے لیے اس کمپنی میں شامل ہوئے تھے، جسے دو برس کے بعد انھوں خیر باد کہہ دیا تھا اور کلی طور پر ریٹائر ہو گئے تھے۔

اس کے بعد وہ وقف کے کاموں میں مشغول ہو گئے تھے۔ وہ بالخصوص مشرقی پاکستان سے اجڑنے والے لوگوں کے لیے کام کر رہے تھے، ان کے رہنے کے لیے مکان، بچوں کے لیے اسکول، ملازمت کے لیے تربیت اور بیماری میں علاج وغیرہ ان کی مشغولیات تھیں۔ وہ بیواؤں اور یتیموں کے وقف کے لیے بھی سرگرمِ عمل تھے، جس سے، ان کے بیٹے کے مطابق، ''انھیں ایسے کاموں میں لطف آتا تھا اور اپنی زندگی کے آخری لمحے تک وہ انھیں میں مشغول رہے۔ وہ کافی دنوں سے بہت بیمار رہنے لگے تھے۔ سرطان ان کے پورے بدن میں پھیل چکا تھا مگر انتقال سے دو ہفتے قبل تک وہ وقف کے دفتر جایا کرتے تھے۔ میں روز صبح دفتر چھوڑنے اور شام کو واپس لانے جایا کرتا تھا۔ آخری دم تک وہ لوگوں کی مدد کے خواہاں رہتے تھے اور ان سے مل کر خوشی محسوس کیا کرتے تھے۔ ایک بار انھوں نے اپنے بھائی سے کہا تھا، 'میرے پاس جتنا بھی وقت ہے میں اپنے بچوں کے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں اور وقف کا جتنا بھی کام ہے میں اس کو ختم کرنا چاہتا ہوں۔ انھیں معلوم تھا کہ ان کے پاس زیادہ وقت نہیں تھا مگر انھوں نے اس موضوع پر کبھی بات نہیں کی۔ اور اس رات جب ان کا انتقال ہوا تھا، وہ اسپتال میں تھے اور دھواں دھار بارش ہو رہی تھی۔ انھوں نے مجھ سے کھڑکی کے پردے سرکانے کے لیے کہا اور اچانک بولے کہ اس کو دیکھ کر کیا تمھیں مشرقی پاکستان یاد نہیں آتا؟ بس یہی ان کے آخری الفاظ تھے۔ انھیں بہت پُرسکون موت نصیب ہوئی۔ آخری وقت شاید بنگال میں گزارے ہوئے کامیاب دن انھیں یاد آتے رہے ہوں گے جہاں انھوں نے اپنی دل چسپ زندگی کا بیشتر وقت گزارا تھا۔''

جب ان کا بڑا بیٹا علی رحیم مجھ سے ملاقات کے بعد واپس ہو رہا تھا تو مجھے اس کے والد عظیم رحیم سے اپنی پہلی ملاقات یاد آ رہی تھی۔ میں نے ڈھاکے کی زمین پر قدم رکھا تھا تو موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ اور جب ہم کلب سے نکل رہے تھے تو بارش تھم چکی تھی اور پورا چاند اپنی جگمگاہٹ سے پورے آسمان پر حاوی دکھائی دے رہا تھا۔ مجھے ہوٹل میں چھوڑتے وقت انھوں نے آہستگی سے اپنی بھاری آواز میں کہا تھا، ''یہ ہے بنگال کا دل، مشرقی پاکستان۔ پیارا، تنک مزاج اور ناقابلِ پیشین گوئی مشرقی پاکستان! مگر ایک بار آپ اس سے پیار کر لیں تو پھر زندگی بھر اس کو پیار ہی کرتے رہیں گے۔''

سلطان احمد

سنگِ خارا

سلطان احمد ایسٹرن فیڈرل یونین کے ان 'تین بندوق برداروں' میں سے تھے جنھوں نے چیف ایگزیکٹیو کی خود ساختہ جلاوطنی میں کمپنی کا انتظام سنبھالا تھا۔ اسی زمانے میں کمپنی کا نام بھی ای ایف یو جنرل کر دیا گیا تھا۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، ان تین بندوق برداروں میں سے دو نواب حسن اور عظیم رحیم اعلیٰ درجے کی محترم شخصیات سمجھے جاتے تھے مگر جیسا کہ آپ آگے چل کر دیکھیں گے، 'سلطان بھائی' اپنے دو پیش رو سربراہوں سے مختلف تھے۔ بیمے کی صنعت کے ان تینوں پیشہ ور افسروں کی کارکردگی مثالی تھی اور تینوں ہی اعلیٰ ترین عہدوں پر پہنچنے میں کامیاب ہوئے تھے۔

جب نواب حسن کو کمپنی کا سربراہ بنایا گیا تو یہ اچنبھے کی بات نہیں لگی تھی۔ اس لیے کہ جب میری میونخ واپسی کی غرض سے ان کو کمپنی میں شامل کیا گیا تھا تو ان کے پاس تمام ضروری اسناد اور صلاحیتیں تھیں۔

عظیم رحیم ایک زمانے سے مشرقی پاکستان میں کمپنی کے کاروبار کے سربراہ تھے۔ ملک کے اس بازو کے کٹ جانے کے بعد جو کچھ بچ رہا تھا اس کو ایک ادارے کی شکل میں باقی رکھنے کے بعد سب سے اعلیٰ عہدے کے لیے عظیم رحیم بھی ایک سنجیدہ امیدوار تھے۔

مگر سلطان احمد اپنی تمام کاروباری زندگی ایک برانچ منیجر رہے تھے اور خود ان کے لیے یہ ایک حیرت کی بات تھی کہ وہ اچانک اپنے علاقے کے سربراہ بھی اور بعد میں کمپنی کے سربراہ بن گئے۔ اگرچہ یہ ایک تعجب خیز اور اور قابل رشک ترقی کی مثال تھی، تاہم میں سمجھتا ہوں کہ کمپنی کے بدلتے ہوئے حالات اور بیمۂ زندگی کی صنعت کو سرکاری تحویل میں لیے جانے کے باعث یہ منطقی بھی تھی۔ صنعت میں اس تبدیلی کے بعد ملک کا پورا نظام اتھل پتھل سے کا شکار تھا اور اس کے ساتھ نئے چہرے بھی ابھر کر سامنے آ گئے تھے۔ ای ایف یو کی انتظامیہ کے ڈھانچے میں تبدیلی کی وجہ سے سلطان احمد کو اہم کردار ملا تھا اور میں اگلے صفحات میں یہ بتانے کی کوشش کروں گا کہ یہ کیوں ہوا اور کیسے۔

اگرچہ ان کی پیدائش ہندوستان کے سب سے بڑے صوبے یو پی کے شہر بریلی میں ۱۹۲۸ء میں ہوئی تھی مگر وہ دیکھنے میں بالکل پٹھان لگتے ہیں۔ کم از کم جب میں نے پہلی بار انھیں ۱۹۶۰ء میں پٹھانوں کے خفیہ دارالحکومت پشاور میں دیکھا تو مجھے ایسا ہی محسوس ہوا تھا۔ دراز قد اور کھلتا ہوا رنگ اس بات کی غمازی کرتا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ ملاقات کے مقام اور اطراف کے ماحول سے مجھے دھوکا ہو گیا ہو اس لیے کہ میں کچھ قبل ہی یورپ سے آیا تھا اور میرے پیش رو مجھے ریل کے طویل سفر کے ذریعے وہاں لے گئے جو ان دنوں ویسے بھی ایک تجربہ تھا۔ ماری انڈس میں واقع کوئلے کی کانیں جو دنیا کے اُس پار واقع تھیں، اور شاید آج بھی اسی کیفیت میں ہوں گی۔ اور وہاں سے پشاور تک کے ایک تحیر خیز سفر کے بعد سلطان احمد کے پیش رَو جناب عطا اللہ ملک نے ریلوے اسٹیشن پر ہمارا خیر مقدم کیا اور ہمیں ڈین ہوٹل لے گئے جہاں اس روز ایک کاکٹیل پارٹی کا انتظام تھا جس میں ایسٹرن فیڈرل یونین کے حریفوں کو مدعو کیا گیا جس میں سلطان احمد بھی شامل تھے۔ چند برس بعد میں اپنے

ہلِ خانہ کو بھی وہاں لے گیا تھا مگر اس وقت سلطان احمد اس دل فریب شہر میں ای ایف یو کے افسر بن چکے تھے۔ انھوں نے ہمیں شہر کی سیر کرائی ور اس دوران وہ ہمیں قصہ خوانی بازار کے ایک چھوٹے سے کارخانے میں لے گئے جہاں طرح طرح کے آتشیں ہتھیار سجے ہوئے تھے جن یں سے کوئی سا بھی خریدا جاسکتا تھا۔ وہ ہمیں مشہور درّۂ خیبر اور لنڈی کوتل بھی لے گئے راستے میں جہاں جنگجویانہ ہتھیاروں سے لیس ایک کبھی ہ ختم ہونے والا قافلہ رواں دواں تھا جسے دیکھ کر ہم بھی مرعوب ہوئے۔ سلطان احمد ہی نے پاک افغان سرحد سے بالکل ملحق دوپہر کے کھانے کا نتظام کیا تھا جس میں قبائل کے سرداروں کے علاوہ حکومت کے پولیٹیکل ایجنٹ ہمارے میزبان تھے۔ تعجب نہیں کہ سلطان احمد کو میں نے ہمیشہ پٹھان ہی سمجھا۔ جب اس کتاب کے سلسلے میں، میں نے ان کی جائے ولادت کے بارے میں سوال کیا تو مجھے احساس ہوا کہ کبھی کبھی پہلی ملاقات بھی کتنی غلط ہوسکتی ہے۔ ربع صدی تک پٹھانوں کے درمیان رہ کر وہ پٹھان ہو بھی جاتے تو کوئی تعجب کی بات نہیں تھی۔

ان کا بچپن یوپی میں گزرا اور وہیں انھوں نے ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی۔ ان کے والد حیوانوں کے ڈاکٹر تھے اور حکومت کے زیرِ نتظام چلنے والے ایک انسٹی ٹیوٹ میں ڈپٹی ڈائریکٹر تھے۔ اس سلسلے میں ۱۹۳۶ء میں ان کا لاہور تبادلہ ہوگیا تھا۔ ماڈل ٹاؤن لاہور میں واقع ماڈل ہائی اسکول سے میٹرک کے امتحان میں کامیابی کے بعد سلطان احمد نے دیال سنگھ کالج میں داخلہ لیا، وہیں سے انٹرمیڈیٹ کیا اور اپنے دو وستوں کے ساتھ مل کر روسی فلموں کی درآمد اور نمائش کا کاروبار شروع کیا۔ اس کاروبار میں ڈھائی برس تک مشغول رہنے کے بعد اپنے والد کے مشورے پر اس سے کنارہ کشی کی اور کافی عرصے سے قائم کوآپریٹیو انشورنس سوسائٹی آف پاکستان میں ملازمت کر لی جس کا صدر دفتر لاہور یں تھا۔ انھوں نے یکم اپریل ۱۹۵۲ء کو کوآپریٹیو انشورنس میں زیرِ تربیت انسپکٹر کی حیثیت سے ملازمت شروع کی تھی۔ اس ملازمت میں ان کو نڈر رائٹنگ اور مارکٹنگ میں کافی عمیق تربیت سے گزرنا پڑا تھا۔ ان کے استادوں میں کمپنی کے جنرل منیجر اور انشورنس کے ممتاز کارکن نسیم احمد نصاری، لنڈن اینڈ لنکا شائر کے مسٹر وہیٹل اور سوئس ری انشورنس کے مسٹر او برائن شامل تھے۔ ان دنوں وہ دونوں کوآپریٹیو انشورنس میں مشیر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ سلطان احمد کمپنی کے چیف ایگزیکٹیو جناب ایس اے محمود سے بھی فیضیاب ہوئے جو پورے پاکستان یں انشورنس کی صنعت میں طویل تجربے کے باعث مشہور تھے۔

پوری طرح سے تربیت یافتہ سلطان احمد پشاور شاخ کے منیجر بن گئے۔ کوآپریٹیو انشورنس کا کاروبار کچھ اس طرح کا تھا کہ ان کے س بڑے صنعتی اداروں کے بیمے کا کاروبار نہیں ہوتا تھا۔ ان کا بیشتر کاروبار 'کھلے بازار' سے آتا تھا جس کو لانے اور سنبھالنے میں کہیں زیادہ نت کرنی پڑتی تھی۔ اس سلسلے میں مشکلات، کاروبار کے حصول کی حکمت اور حریف اداروں کی مسابقت کے ضمن میں سلطان احمد کا اپنے فسرانِ اعلیٰ سے اختلاف رہتا تھا۔ جب میں نے ان سے انشورنس کے ابتدائی دنوں کے بارے میں سوال کیا تو وہ بولے، ''مجھے جلد ہی ندازہ ہوگیا تھا کہ میں کوآپریٹیو انشورنس سوسائٹی کے لیے ناموزوں شخص تھا اور یہ بھی کہ مجھے اس صنعت کی دوسری بیمہ کمپنیوں کے کاروباری ر معاشیاتی اصول بہتر لگتے تھے۔ کاروبار کے اہم معاملات پر میرا اختلاف روز کا معمول ہوگیا تھا۔ چوں کہ مجھے اپنا کام پسند تھا اس لیے میں ی تندہی اپنے فرائض انجام دیتا تھا مگر میرے اطراف جو لوگ تھے وہ میرے جذبۂ کار اور پیشے کے بارے میں میری سنجیدگی سے اتفاق نہیں کرتے تھے۔ ان کے نزدیک یہ صرف ایک ملازمت تھی جو صرف پیسہ کمانے اور زندگی گزارنے کا ذریعہ تھی۔ مگر میں ان کے خیالات سے طمئن نہیں تھا۔ میں اپنے کام اور اپنے ادارے میں، جس کے لیے کام کر رہا تھا، اپنی شناخت قائم کرنا چاہتا تھا۔ اس طرح میں اپنے اروباری ساتھیوں کے خیالات کے اعتبار سے ناموزوں تھا۔''

پھر تقدیر کا کرنا یوں ہوا کہ اس زمانے میں FFU کے منیجر برائے مغربی پاکستان جناب معین الدین اور مسٹر بھیم جی شال میں اپنی ناخوں کے دورے پر آئے ہوئے تھے جن میں پشاور کی شاخ بھی شامل تھی۔ ایک مشترکہ دوست جناب نجم الدین احمد نے اپنے دولت نے پر ان لوگوں کے اعزاز میں دعوت کا اہتمام کیا جس میں سلطان احمد بھی مدعو تھے۔ راولپنڈی میں جنرل ڈپارٹمنٹ کے کرتا دھرتا جناب

نیاز احمد خان نے اپنی انتظامیہ سے سفارش کی تھی کہ وہ سلطان احمد کو ای ایف یو میں لانے کی کوشش کریں۔

اس تجویز کی ان لوگوں نے پُر زور حمایت کی جو سلطان احمد اور مسٹر بھیم جی دونوں سے واقف تھے۔ معین الدین صاحب نے بھی اس سلسلے میں بات کی۔ بعد میں میاں سعید احمد نے سلسلہ جنبانی کی اور بالآخر سلطان احمد نے ای ایف یو میں شمولیت کا فیصلہ کر لیا۔ کوآپریٹو انشورنس میں دس برس کام کرنے کے بعد سلطان احمد پشاور میں ای ایف یو کے برانچ منیجر بن گئے۔ اس طرح میری اس 'پٹھان' سے پھر ملاقات ہوئی اور ان کی خوب رُو اہلیہ عنیزہ سے بھی جن سے دو بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے۔

سلطان احمد نے ای ایف یو میں اپنے ابتدائی دنوں کے بارے میں بتایا کہ ''میری تنخواہ ۷۵۰/روپے سے شروع ہوئی تھی، اس کے علاوہ کوئی الاؤنس نہیں تھا۔ ان دنوں عام طور پر اس تنخواہ میں بس گزارا ہو جاتا تھا۔ ابھی مجھے چند ماہ ہی ہوئے تھے کہ ایک دن راولپنڈی میں لائف ڈپارٹمنٹ کے چیف مجھ سے ملنے آئے اور انھوں نے مشورہ دیا کہ میں اپنی بیوی کے نام سے ایجنسی لے لوں اور کچھ زندگی کے بیمے کا کاروبار بھی کروں تاکہ کچھ اضافی آمدنی ہو جائے۔ میں نے ان کے مشورے پر عمل کیا اور ان کا شکر گزار ہوا اس لیے کہ واقعی برانچ منیجر کی تنخواہ میں میرا گزارا نہیں ہو رہا تھا۔ میں یہ بتاتا چلوں کہ جناب معین الدین جو مغربی پاکستان کے منیجر تھے اس بات سے خوش نہیں ہوتے تھے کہ ان کے لوگ لائف ڈپارٹمنٹ کے لیے کام کرنا شروع کر دیں۔ مگر انھوں نے اس بات پر رضامندی کا اظہار کر دیا کہ جنرل ڈپارٹمنٹ کے کچھ افسران یہ کام کر سکتے ہیں اور ان سے میں ایک میں تھا۔ اس طرح ہونے والی آمدنی سے ہماری زندگی کچھ آسان ہو گئی۔''

سلطان احمد ۱۹۷۵ء تک اس عہدے پر فائز رہے۔ انتظامیہ کی طرف سے طویل عرصے کی منصوبہ بندی کے تحت یہ طے پایا تھا کہ میاں سعید احمد کی ریٹائرمنٹ کے بعد سلطان احمد کو ان کی جگہ مغربی پاکستان کا منیجر بنانے کے لیے تیار کیا جائے۔ پہلے تو سلطان احمد کو لاہور کے زونل آفس میں نائب بنایا گیا اور بالآخر وہ میاں سعید احمد کے ڈائریکٹر اور مشیر بن جانے کے بعد سینئر ایگزیکٹیو وائس پریزیڈنٹ بنا دیے گئے۔

بھٹو حکومت کے نیشنلائزیشن کی وجہ سے یہ بہت مشکل دور تھا، صرف ای ایف یو ہی کے لیے نہیں پورے ملک کی معشیت کے لیے بھی۔ ان کے برق رفتار فیصلوں سے ان کی پارٹی کے ارکان خوش تھے مگر اس کی وجہ سے بین الاقوامی سطح پر پاکستان کی ساکھ متاثر ہوئی تھی اور سرمایہ ملک سے باہر جانے لگا تھا۔ یہ سب وجوہات ملکی ترقی کی رفتار پر منفی اثرات کا باعث ہوئیں جس نے ملک میں بیمے کی صنعت کو بھی نقصان پہنچایا۔ چوں کہ زندگی کے بیمے کی صنعت اب حکومت کے ہاتھ میں تھی اس لیے بڑی بیمہ کمپنیوں کے اثاثے ان کے ہاتھ سے چھن گئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ صنعت کے بہت سے رہنما ملک چھوڑ کر چلے گئے اور غیر ملکوں میں انشورنس کمپنیاں کھولنے کی کوشش میں رہے۔ ان میں روشن علی بھیم جی بھی شامل تھے۔

مسٹر بھیم جی کے ملک چھوڑ کر چلے جانے سے نہ صرف یہ کہ ملک کی سب سے بڑی بیمہ کمپنی پر منفی اثر پڑا بلکہ اس کے دور رس اثرات دوسری صنعتوں پر بھی پڑے۔ اس کے نتیجے میں ای ایف یو کی مرکزی حیثیت باقی نہ رہی جس پر اس کو ناز تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس ادارے کے بہت سے کامیاب افسر بھی دوسرے ملکوں میں نئے امکانات کی تلاش میں نکل گئے۔ یہ کیفیت پندرہ برس تک رہی اور اس زمانے میں سلطان احمد نے ایک اہم کردار ادا کیا۔

مسٹر بھیم جی کی چھوڑی ہوئی کرسی کے بظاہر وارث نواب حسن اس وقت ٹھہرے جب انھوں نے اپنے پرانے دوست آغا حسن عابدی کے ساتھ، ان کے ادارے بینک آف کریڈٹ اینڈ کامرس کے تعاون سے کریڈٹ اینڈ کامرس انشورنس کمپنی کی برطانیہ اور مشرقِ وسطیٰ میں بنیاد رکھی۔ اس تیاری میں نواب حسن کو سینئر ایگزیکٹیو وائس پریزیڈنٹ اور کمپنی کا دوسرا اہم افسر بنا دیا گیا تھا۔ یہ ۱۹۷۲ء کا واقعہ ہے۔ مگر اس کے بعد حالات نے تیزی سے کروٹ بدلی اور عابدی صاحب کے بینک کی ناقابلِ یقین تیز ترقی پر سارے منصوبوں پر نظرِ ثانی کی گئی۔ ملک سے باہر نواب حسن کی خدمات کی ضرورت پیش آئی اور ان کی جگہ پاکستان میں عظیم رحیم کو کمپنی کا نیا سربراہ بنا دیا گیا۔ مسٹر بھیم جی چیئرمین اور

نواب حسن ٹیکنیکل ایڈوائزر کی حیثیتوں میں ای ایف یو سے منسلک رہے مگر اس کا مرکزی کردار قائم نہیں رہ سکا اور مسٹر محمد چودھری کی سربراہی میں یہ مقام آدمجی انشورنس کمپنی کو مل گیا۔ مسٹر بھیم جی کو جو کمپنی کے سب سے بڑے حصے دار تھے کوئی خوش فہمی نہ تھی اس لیے کہ وہ ہمیشہ یہی سمجھتے رہے تھے کہ بھٹو کی حکومت بالآخر جنرل انشورنس کے کاروبار کو بھی ہتھیا لے گی۔ مگر جیسا کہ سب جانتے ہیں، یہ نہیں ہوا۔ نواب حسن کو ملک واپس بلا لیا گیا اور عظیم رحیم نے جو ریٹائرمنٹ کے قریب تھے، نواب حسن کے لیے جگہ خالی کردی۔ یہ عارضی انتظام تھا اس لیے کہ نواب حسن کی صحت ٹھیک نہیں تھی اور یہ فیصلہ ہونا تھا کہ ان مشکل حالات میں کمپنی کی باگ ڈور کون سنبھال سکتا ہے جو تجربہ کار بھی ہو اور کمپنی کے کارکنان بھی جس کا احترام کریں۔

تو فیصلہ یہ ہوا کہ سلطان احمد کو چیف ایگزیکٹو بنا دیا جائے۔ بیس برس بعد آج بھی کمپنی کے اندر اور باہر کے لوگوں کی طرح انھیں بھی اس بات پر حیرت ہے۔ سلطان احمد نے کہا، ''سچ پوچھیے تو مجھے کبھی خیال بھی نہیں آیا تھا کہ میں اس رتبے تک پہنچوں گا۔ میں تو اس کا خواب بھی نہیں دیکھتا تھا۔ اس لیے کہ مجھے کمپنی کے صدر دفتر میں کام کا کوئی تجربہ بھی نہیں تھا۔ اسی وجہ سے مسٹر بھیم جی نے از راہِ مہربانی نواب حسن صاحب کو مینجنگ ڈائریکٹر اور چیف ایگزیکٹو کے عہدے پر فائز کردیا اور میں نے کمپنی کے صدر کی حیثیت سے کام شروع کردیا۔ اس طرح مجھے کچھ وقت مل گیا جس میں نواب حسن صاحب کی رہنمائی میں مجھے تجربہ حاصل کرنے کا موقع مل گیا، جس کے لیے میں ان کا شکر گزار ہوں۔ یہ انتظام ڈیڑھ برس تک چلا۔ اس کے بعد میں اس قابل ہوسکا کہ کمپنی کے مینجنگ ڈائریکٹر کا عہدہ سنبھال سکوں۔''

سلطان احمد سے ملاقات، ان کے اپنے بارے میں، زندگی میں ان کے ہدف اور کامیابیوں کے بارے باتیں کرنا بذاتِ خود بھی ایک تجربے سے کم نہیں۔ میں ان سے کم و بیش چالیس برس سے واقف ہوں، ایسے انسان سے جو پشاور کی وادیوں کی گم نامی، اس کے چشموں اور دریاؤں، اس کے بے شمار دیہات اور درختوں کے جھنڈ کے سائے سے اچانک نکل کر ہمارے دور کے عظیم شہر کراچی کے ساحل اور پُرشور شاہراہوں پر آنکلا ہے۔

سلطان احمد کہتے ہیں کہ ''اپنی تمام عمر میں نے محنت سے کام کرنے میں یقین رکھا ہے۔ میں اپنے مالکوں سے ہمیشہ مخلص رہا ہوں۔ اگر انھیں فائدہ ہوا ہے تو مجھے خوشی ہوئی ہے، اور اگر نقصان ہوا ہے تو مجھے دُکھ ہوا ہے۔ میرا مقصد کمپنی کو اُسی طرح کامیاب بنانا رہا جس طرح میں اپنے بارے میں چاہتا ہوں۔ کمپنی اور میں دونوں ایک رہے ہیں اور میں نے اس میں کوئی تفریق نہیں رکھی۔''

اور جب وہ یہ کہتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں ان سے ۱۹۶۲ء میں باتیں کررہا ہوں، جب پہلی بار انھوں نے کمپنی کی پشاور شاخ کا انتظام سنبھالا تھا۔ ویسے ہی الفاظ اور وہی آدمی! ان کے لیے کمپنی کے اس بڑے عہدے کی چکا چوند جس پر وہ پندرہ برس تک فائز رہے ہے، گزرے دنوں کی دُھول سے زیادہ نہیں۔ جب بھی کمپنی کو ضرورت ہوئی وہ کمربستہ موجود رہے ہیں خواہ وہ بے حد مشکل دن ہی کیوں نہ رہے ہوں۔ اپنی پیشہ ورانہ زندگی کے پہاڑوں اور جدوجہد کی وادیوں سے تنِ تنہا سفر کی طویل کہانی سناتے ہوئے سلطان احمد کہتے ہیں، ''جب میں کراچی آیا تو میں ویسا پریزیڈنٹ نہیں تھا جس کو میرے تمام ساتھی خوش آمدید کہتے۔ سب کو حیرت بھی تھی اور نظر انداز کیے جانے کا احساس بھی تھا مگر مجھے کسی خاص حلقے سے کوئی مشکل پیش نہیں آئی، تقریباً سب ہی مہربان اور تعاون کے لیے تیار تھے، تاہم مجھے یہ ضرور محسوس ہورہا تھا کہ یہ لوگ مجھے پسند نہیں کرتے۔ مجھے یہ بھی محسوس ہوتا تھا کہ ان کے نزدیک اس 'شمال سے آنے والے آدمی' اور 'اس پشاور والے کی یہاں ضرورت تو نہیں تھی!' یہ میرے لیے پریشانی کی بات ہوسکتی تھی مگر مسٹر بھیم جی اور نواب حسن دونوں نے میری ڈھارس بندھائی، مجھے پورا تعاون مہیا کیا اور میری مکمل پشت پناہی کی۔ اس بڑے شہر میں میرے بہت سے دوست بھی تھے جنھوں نے میری رہنمائی بھی کی اور خود اعتمادی کی راہ پر گامزن بھی کیا۔ کچھ تو ان لوگوں نے میری امداد کی اور کچھ میں نے بھی موقعے کی مناسبت سے ہمت کی، اس لیے اور بھی مجھے اس بات کا پورا یقین تھا کہ میں جو کچھ بھی کررہا ہوں وہ صرف کمپنی کی بھلائی کے لیے۔''

جب سلطان احمد یہ سب کچھ کہہ رہے تھے تو ان کے چہرے پر اطمینان لہریں لے رہا تھا، وہ بہت پُرسکون دکھائی دے رہے تھے۔ وہ ایک مسرور انسان نظر آرہے تھے۔ ویسا ہی جسے ان کے صدر نے مشکل حالات میں ادارے کی کشتی کھینچنے کے لیے منتخب کیا تھا۔ ایک مشکل اور جدو جہد کا سفر جس کو صرف ایک طاقت ور انسان ہی کامیابی اور حفاظت سے طے کر سکتا تھا۔

سلطان احمد نے اپنے خیالات کے منہ زور دھاروں کو سمیٹتے ہوئے کہا، ''میں ۱۹۹۰ء میں مینجنگ ڈائریکٹر کی حیثیت سے ریٹائر ہوا اور تین برس کے عرصے کے لیے مجھے نائب صدر کی ذمے داری سونپی گئی۔ اس کے بعد سے میں کمپنی کے بورڈ پر ڈائریکٹر ہوں۔ اس پر مجھے فخر بھی ہے اور میرے لیے اعزاز کی بات بھی۔ اب میں لاہور منتقل ہو گیا ہوں اس لیے کہ وہاں سکون محسوس کرتا ہوں۔ میرے والدین کا گھر بھی لاہور میں تھا اور جب میں ۱۹۷۵ء میں زونل منیجر بنا تھا اس وقت میں نے بھی اپنا ایک گھر بنا لیا تھا۔ ایسٹرن فیڈرل یونین میں کام کر کے میں بہت مطمئن ہوں۔ میں یہ بھی محسوس کرتا ہوں کہ جو بھی ذمے دارے سونپی گئی اسے میں نے بدرجۂ احسن نبھانے کی کوشش کی ہے۔ میں نہایت مسرور انسان ہوں۔''

سلطان احمد ان 'تین تفنگ بردار' کارکنوں میں سے ایک تھے جنھیں کمپنی کے چیئرمین نے اپنی خود ساختہ جلاوطنی کے دوران ادارے کے قلعے کی حفاظت کی ناخوشگوار ذمے داری سونپی تھی۔ ان میں سے سلطان احمد سب سے طویل عرصے تک یہ ذمے داری نبھاتے رہے۔ اور بلا شبہ انھوں نے اس ذمے داری کو ماضی میں اپنی کارکردگی کا انعام سمجھ کر نہیں بلکہ ایک ذاتی چیلنج سمجھ کو قبول بھی کیا اور نبھایا بھی۔ وہ جن حالات سے گزرے اس کا انھیں کبھی گمان بھی نہیں تھا۔ اسی وجہ سے وہ ناگفتہ بہ حالات سے دوچار ہوئے تھے مگر دیکھا جائے تو سلطان احمد اس ادارے کے اچھے سربراہوں میں سے ایک تھے۔ مجھے تو وہ ہمیشہ چٹان کی مانند دکھائی دیے، اور میرے خیال میں کسی انداز سے بھی دیکھا جائے تو یہ ایک مستحسن صلاحیت ہے۔

ڈاکٹر محمد سعید خان

ایک پہلکار طبیب

میری میز پر، بالکل میرے سامنے، ایک بہت پرانی تصویر ہے جو اندازاً بیس برس قبل کھینچی گئی تھی۔ اس میں تقریباً ساٹھ برس سے اوپر کی عمر کی ایک ممتاز شخصیت اور ایک انگریز خاتون ہیں، جو اس وقت تک اپنی عمر کا بیشتر حصہ پہلے یو پی میں اور پھر تقسیم کے بعد پاکستان کے شہر کراچی میں بسر کرنے کے باوجود بھی انگریز دکھائی دے رہی تھیں۔

جب ہم پہلی بار ۱۹۶۰ء میں ایک دوسرے سے ملے اس وقت عمر میں وہ مجھ سے بڑے تھے۔ مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہمیں دوست بننے میں کوئی مشکل نہیں پیش آئی۔ ہم لوگ رفیقِ کار پہلے بنے تھے اس لیے کہ وہ اس وقت بھی چیف میڈیکل آفیسر تھے جب میں نے اس ادارے میں شمولیت اختیار کی تھی۔

ڈاکٹر سعید خان MRCS (Eng) LRCP لندن کے تعلیم یافتہ تھے اور بلا شبہ ان اعلیٰ نسل کے لوگوں میں سے تھے جو اس زمانے میں ای ایف یو کی انتظامیہ میں شامل تھے۔ انتظامیہ کی ٹیم میں سعید خان جیسی شخصیت کی موجودگی بھی اس بات کا ثبوت تھی کہ صرف اعلیٰ درجے کے لوگوں کے ہجوم ہی سے خود بہ خود اچھی ٹیم نہیں بن جایا کرتی۔ اس کے لیے کسی کرشماتی شخصیت اور وجدانی رہنمائی کی بھی ضرورت ہوتی ہے جس سے ٹیم میں فنکارانہ ہنرمندی پیدا ہوتی ہے۔

ڈاکٹر سعید خان ایک خود بیں اور انانیت پسند انسان تھے۔ وہ یو پی کے اعلیٰ درجے کے خاندان میں پیدا ہوئے اور وہیں ان کی ابتدائی تعلیم ہوئی۔ بچپن ہی سے ان کے دل میں ڈاکٹر بننے کی امنگ تھی کہ وہ شفا حاصل کرنے میں لوگوں کی مدد کریں۔ ان کے والد نے انھیں اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان بھیج دیا اور ان کی کوششوں ہی سے وہ اعلیٰ پیانے کی اسناد سے سرفراز ہوئے۔ انگلستان کا قیام ان کی آئندہ زندگی پر بہت اثر انداز ہوا۔ ازابیل کی صورت میں انھیں ایک خوب صورت، شائستہ اور نوجوان لڑکی مل گئی جس کی مدد سے انھوں نے محبت اور زندگی کی للکار کا مقابلہ کیا۔ انھوں نے شادی کر لی اور ان کے دو پیاری پیاری لڑکیاں پیدا ہوئیں جو دو مختلف تہذیبوں کے سنگم، قدامت پسندی اور روایتی اثرات سے مملو مشرقیت اور مغربی طرزِ حیات اور ماحول کی آزاد خیالی کے امتزاج میں پلیں بڑھیں۔

انگلستان میں اپنی تعلیم کے کامیاب اختتام کے بعد وہ واپس وطن لوٹے اور کام شروع کیا، پہلے کچھ اسپتالوں میں اور بعد میں خود اپنا مطب کھول لیا۔ جب تقسیمِ ہند ہوئی اس وقت ان کی عمر چالیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ انھوں نے پاکستان ہجرت کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ان کے اس فیصلے کے سب سے بڑے محرک جناب محمد وصال الدین تھے، جو انھیں یو پی میں بچپن کے دنوں سے جانتے تھے۔ غالباً ۱۹۴۹ء میں ڈاکٹر سعید خان اور ان کے اہلِ خانہ کراچی منتقل ہو گئے۔ وصال الدین اور ان کے دو بھائی ای ایف یو میں زندگی کے شعبے سے منسلک تھے۔ وصال الدین اس شعبے کے سربراہ تھے اور انھوں نے چیف میڈیکل انڈر رائٹر کے عہدے کے لیے ڈاکٹر سعید خان کی سفارش کی، جس پر وہ ۱۹۶۹ء میں

ریٹائرمنٹ کے وقت تک فائز رہے۔ چیف میڈیکل انڈر رائٹر ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ادارے کے چیف میڈیکل ڈائریکٹر بھی رہے اور ادارے کے ملازمین اوران کے اہل خاندان کی دیکھ بھال بھی کی۔ 'مسوری کلینک' کے نام سے ان کا اپنا مطب بھی تھا جس پر انھیں فخر تھا۔

ڈاکٹر سعید خان نہایت نفیس اور منجھے ہوئے انسان تھے۔ بہت مہذب اور متوازن۔ پاکستان کی تاریخ میں وہ پہلے میڈیکل ڈاکٹر تھے جسے طبی اور سائنسی انداز میں انڈر رائٹنگ کرنے کا احساس ہوا۔ میونخ ری انشورنس کمپنی کی معاونت سے انھوں نے اس نوعیت کی انڈ رائٹنگ کو آگے بڑھایا، جس نے سائنسی انداز میں 'غیر معیاری' زندگیوں (بیمار لوگوں) کو بیمہ مہیا کرنے کا طریقہ کار ایجاد کیا تھا۔ اس طریقے سے ان لوگوں اور خاندانوں کی بیمے کی ضروریات پوری کی گئی تھیں جو اپنی صحت کی خرابی کے باعث اس نعمت سے محروم رکھے جاتے تھے۔ کمپنی کے اسٹاف ڈاکٹر کی حیثیت میں انھوں نے نہ صرف بہت سے ملازمین کی صحت کی بہتری میں مدد کی بلکہ کئی زندگیاں بچائی بھی تھیں۔ مجھے ایک مثال خصوصاً یاد آتی ہے۔ جس رات کے ایف حیدر شدید علیل ہو کر انتقال کر گئے، ڈاکٹر سعید خان ان کے سرہانے موجود تھے۔ حیدر صاحب برسوں ان کے افسر رہے تھے مگر بعد میں وہ کمپنی چھوڑ کر پاکستان انشورنس کارپوریشن کے چیئرمین بن گئے تھے۔ اس تبدیلی کے باوجود وہ سعید خان کے مریض رہے اور انھوں نے ایک عرصے تک حیدر صاحب اور ان کے اہلِ خاندان کی اسی طرح خدمت بھی کی اور دوستی بھی نبھائی۔

میں بھی ان کے مطب جایا کرتا تھا، زیادہ تر وہ انجکشن لگوانے جو اس زمانے میں ملک سے باہر سفر کے لیے ضروری ہوتے تھے۔ ہمارا خاندانی میل ملاپ ہمیشہ ذاتی نوعیت کا رہا تھا۔ ان کی بیٹیوں کی شادی ہونے کے بعد ازابیل بہت تنہا اور اداس رہا کرتی تھیں اور کبھی کبھی انھیں دوستانہ دل جوئی کی ضرورت پڑتی تھی جو فرض ہم میاں بیوی ادا کیا کرتے تھے۔ زیادہ تر ہم لوگ کراچی جیم خانہ جایا کرتے تھے جہاں اس زمانے میں اتنا مجمع نہیں ہوا کرتا تھا جیسا کہ آج کل ہوتا ہے۔ سرِشام برآمدے میں فرحت بخش سمندری ہوائیں جسم و جاں کو تازہ کر دیتی تھیں جہاں بیٹھ کر مشروب اور مشروب کے لوازمات کام و دہن کو لذتوں سے آسودہ کر دیتے تھے۔

دسمبر ۱۹۷۰ء میں مشرقی پاکستان کے سانحے نے بھی ان کے خاندن پر گہرا اثر کیا تھا، اس لیے کہ ان کی ایک بیٹی ملک کے اسی خطے کے نوجوان سے بیاہی تھی۔ وہ سفارتی عملے میں سے تھا اور بنگلہ دیش بننے کے بعد اس نے اپنے ملک کی ملازمت کو ترجیح دی تھی۔ یہ سب مجھے مشترکہ دوستوں سے معلوم ہوا تھا اس لیے کہ ان دنوں اپنی ملازمت کے سلسلے میں میرا قیام جرمنی میں تھا اور مشرقِ بعید کے ممالک میرے ذمے تھے جہاں آنا جانا زیادہ رہتا تھا۔ اس تبدیلی کی وجہ سے ہمارے بیشتر دوست فاصلوں کی دھند میں گم ہو گئے تھے۔

اپنے پرانے دوستوں کے ذریعے میں نے سعید خان کے بچوں کو تلاش کیا تھا مگر کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی۔ اس باب کو تحریر کرنے کے لیے مجھے صرف اپنی یادداشت پر انحصار کرنا پڑا ہے۔ مگر ای ایف یو کے بارے میں کوئی کتاب وغیرہ بھی دستیاب نہیں تھی۔ میری خواہش تھی کہ میں اس حیرت انگیز انسان کے بارے میں اور تفصیلات مہیا کرتا اور کاش نہ صرف کمپنی بلکہ اس ملک کے بیمے کی صنعت کے لیے اس کی خدمات اور اس کے کارہائے نمایاں کا کچھ حق ادا کر سکتا۔

ای ایف یو کے چیف ایجنٹ ابوالمحمود

ابو المحمود

کامیابی کا نشان

وہ آج بھی ایسٹرن فیڈرل یونین کی ایسی روایتی شخصیت ہیں جس نے ۱۹۷۲ء کی اتھل پتھل سے قبل پاکستان میں بیمے کی صنعت میں کاروباری سلسلے میں کمپنی کا وقار بلند کیا تھا۔ ساٹھ کے عشرے سے اگر آپ کمپنی کے مجلّے کی ورق گردانی کریں تو تقریباً ہر اشاعت میں، لائف ڈپارٹمنٹ کی کارکردگی کے سلسلے میں آپ کو ان کا تذکرہ اور ساتھ ہی ان کو اور اُن کی خوب صورت بیوی کی تصویر دیکھنے کو ملے گی، اس لیے کہ بیش تر مہینوں میں وہی سب سے زیادہ کاروبار کرتے تھے۔ اب وہ ای ایف یو جنرل کے چیف ایجنٹ ہیں اور اب بھی وہ کمپنی کے ایجنٹوں کی فوج کے ہراول دستے کے مانند ہیں۔ اور جب میں اس ادارے سے منسلک ہوا تو ابول بھائی اس وقت کمپنی میں موجود تھے۔

ان میں کوئی تبدیلی نظر نہیں آتی۔ ہمیشہ کی طرح مصروفیت سے معمور بے چینی ہی ان کی شخصیت کا 'تھرمامیٹر' ہے جو ان کو ہمہ وقت متحرک رکھتی ہے۔ ان کا چہرہ آج بھی اسی طرح تازہ و تابندہ ہے جیسا کہ اس دن تھا جب ہم پہلی بار ایک دوسرے سے ملے تھے۔ جب بھی ملتے ہیں جلدی میں ہوتے ہیں اور ان سے ملاقات کا وقفہ ایک یا دو سگریٹ نوشی کی طوالت سے زیادہ نہیں ہوتا۔ جسامت سے متناسب گول مٹول چہرے والے ابول بھائی کے پاس ہمیشہ تازہ خبریں اور دل چسپ قصے ہوتے ہیں۔ وہ کسی کے ساتھ ہوں، کے ایف حیدر، خدا بخش، روشن علی بھیم جی، سیف الدین زومکاوالا یا میں، ان کی اتار چڑھاؤ سے مملو رسیلی آواز دروازے کے باہر سے بھی سنائی دے گی۔ اگر چہ وہ شکایتیں کررہے ہوں گے مگر آواز میں ایک کھلنڈرا پن ہوگا جو کاروبار میں ان کی کامیابی کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔

ابوالمحمود صاحب اکتوبر ۱۹۲۴ء میں مغربی بنگال کے شہر کلکتے میں پیدا ہوئے تھے جو بہت سی ایسی سربرآوردہ شخصیتوں کا مسکن رہا ہے جنھوں نے ہندوستان اور پاکستان کی تاریخ میں نمایاں کردار ادا کیے تھے جو ان کی آزادی پر منتج ہوئے۔ اس وسیع اور گنجان شہر سے اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ۱۹۴۱ء میں وہ برطانوی ہند کی حکومت میں ملازم ہو گئے۔ تین برس تک اپنے مولد میں کام کرنے کے بعد ان کا تبادلہ دلّی ہوگیا جہاں وہ وزارتِ صنعت سے تقسیم ہند تک منسلک رہے۔ تقسیم کے وقت انھوں نے پاکستان منتقل ہونے کا فیصلہ کیا۔ وہ پاکستان آئے تو پہلے تو اپنی وزارت ہی میں تعینات ہوئے مگر جلد ہی ان کا تبادلہ وزارتِ خارجہ میں ہوگیا۔ وہ پاکستان کے کئی سفارت خانوں میں تعینات ہوئے۔ جب میری ان سے نشست ہوئی تو اپنے مخصوص انداز میں پرانے زمانے کی یادیں تازہ کرتے ہوئی انھوں نے کہا، ''میں نے سوچا کہ میں کسی اور شعبے میں یقیناً اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کرسکتا ہوں۔ ابھی میں اس سوچ میں ہی تھا کہ میں کیا کروں کہ وزارتِ مال کے ایک ساتھی سے ملاقات ہوئی جو حکومت کے مہیا کیے ہوئے کوارٹر میں مجھ سے ملاقات کے لیے آیا تھا اور اس نے مجھے ایک بیمہ پالیسی فروخت کرنے کی کوشش کی۔ میں نے اس سے معذرت کرلی اس لیے کہ مجھ میں پریمیم کی رقم ادا کرنے کی استطاعت نہیں تھی۔ جواب میں اس نے مشورہ دیا کہ میں پریمیم دینے کے لیے اپنے پراویڈنٹ فنڈ کی رقم استعمال کرسکتا ہوں جو ایک اچھا مشورہ تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ میں اس پر غور

کروں گا مگر مجھے اس کے لیے کچھ وقت چاہیے اور اس سے ایک دو ہفتے بعد آنے کے لیے کہا۔ اس دوران کچھ حیرت انگیز بات ہوئی، میرے ذہن پر ایک بجلی سی گری۔ مجھے ایسا محسوس ہوا گویا خدا نے مجھے اپنی موجودہ مشکلات سے نکلنے کا راستہ دکھا دیا کہ میں خود ہی کیوں نہ انشورنس ایجنٹ بن جاؤں۔ اور میں نے اسی خاتون، نرگس رحیم کے نام سے جس سے چند ماہ بعد میری شادی ہوگئی، انشورنس ایجنٹ بننے کی درخواست گزار دی۔ یہ درخواست شادی کے بعد مکمل ہوئی اور مجھے نرگس محمود کے نام سے لائسنس مل گیا۔ اس کے بعد سے میرا سارا کاروبار اس نام سے ہوا اور آج بھی جنرل انشورنس کا میرا کاروبار اسی نام سے ہوتا ہے۔ جب میں اپنے ماضی پر غور کرتا ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا کوئی اوپر والا ہے جو میرے سب کام بناتا ہے۔ اس لیے کہ ابتدا ہی سے میں بے حد کامیاب رہا ہوں۔ ہر موڑ پر کامیابی میری منتظر رہی ہے۔ میں نے وزارتِ خارجہ میں اوپر سے لے کر نیچے تک تمام لوگوں کو بیمہ پالیسی فروخت کی اور سب کی سب پراویڈنٹ فنڈ سے۔ اور میں نے بہت دولت کمائی ہے۔ زندگی کے بیمے کا کام شروع کرنے کے ڈیڑھ سال بعد ہی میں نے اپنی پہلی موٹر کار خرید لی تھی اور وہ بھی صرف جز وقتی ایجنٹ کی حیثیت سے۔ اور ایک طرح سے یہ کار ہی میرے پیشے میں تبدیلی کا باعث ہوئی تھی۔ اس لیے کہ میرے لیے یہ مشکل تھا کہ اس ملازمت میں ہوتے ہوئے میرے پاس اتنی رقم ہو اور اپنی کار ہو۔ اور چوں کہ مجھ میں کچھ جسمانی خامی بھی تھی اس لیے میں نے ریٹائرمنٹ کی درخواست دے دی جو منظور کر لی گئی۔ بس اس کے بعد سے میں تھا اور زندگی کا بیمہ۔ بس کبھی یہاں کبھی وہاں، کام چلتا رہا۔ مگر میں نے کبھی اپنی کمپنی نہیں بدلی۔ میں عمر بھر ہمیشہ ایسٹرن فیڈرل یونین کے ساتھ رہا سوائے اس وقت کے جب بیمے کو قومی ملکیت میں لے لیا گیا اور میں اسٹیٹ لائف کا حصہ بن گیا۔ میں اپنے لیے اور ایسٹرن فیڈرل یونین دونوں کے لیے کامیاب رہا۔ پہلے مسٹر حیدر جیسا شریف النفس انسان، خدا بخش جیسا بیمۂ زندگی کا دیوانہ اور پھر مسٹر بھیم جی آ گئے۔ وہ خود بھی زندگی کے بیمے کے سیلز مین رہے تھے اور اس پیشے کی مشکلات کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ میں اس وقت تک بہت خوش تھا جب تک میں انشورنس ایگزیکٹیو بن کر اس کی اندرونی ریشہ دوانیوں اور سیاست کے جنجال میں نہیں پھنس گیا تھا۔ پھر میں نے افسری سے استعفیٰ دے کر اپنا کاروبار شروع کر دیا۔ مگر میری رگ رگ میں بیمہ سرایت کر چکا تھا۔ جب اسٹیٹ لائف بنی اور اس ادارے نے مجھے اعلیٰ افسر بنانے کا فیصلہ کیا تو میں بھی راضی ہوگیا۔ میں اسٹیٹ لائف میں چار سال تک رہ سکا۔ میں نے پھر اپنا کاروبار شروع کر دیا تھا مگر پھر میں تھا اور حیرتِ یک شہر آرزو۔ بیمۂ زندگی کے چنگل سے آزادی ممکن نہ تھی اس لیے کہ یہ مجھ میں اپنے پنجے پوری طرح گاڑ چکا تھا اور جنوری ۱۹۸۷ء میں پھر اپنی پرانی کمپنی ایسٹرن فیڈرل یونین کا اسیر ہوگیا جو اب ای ایف یو جنرل بن چکی تھی اور میں نے جنرل بیمے کا کاروبار شروع کر دیا۔ بہت سے لوگ حیران ہو رہے تھے کہ بھلا لائف انشورنس کا ایک پرانا آدمی اچانک جنرل انشورنس میں کیسے کام کرنے لگا اور وہ بھی بڑی کامیابی کے ساتھ۔ اس میں شبہ نہیں کہ مجھے بہت کچھ نئے سرے سے سیکھنا پڑا تھا اور آج، جیسا کہ شاید آپ جانتے ہوں، میں اچھا خاصا کما رہا ہوں۔ اگر چہ یہ کہا جاتا ہے کی جنرل انشورنس میں پیسے کمانا اس لیے مشکل ہے کہ اس کاروبار میں گاہک کمیشن مانگتے ہیں اور دینا بھی پڑتا ہے۔ مگر میں اس سے بالکل اتفاق نہیں کرتا۔ شاید میں خوش قسمت انسان ہوں اس لیے کہ میں کبھی کمیشن نہیں دیتا۔ میں جنرل پالیسی بھی اسی طرح فروخت کرتا ہوں جیسے بغیر کمیشن دیے لائف انشورنس فروخت کرتا تھا۔ اس ملک میں بھی یہ ممکن ہے۔ مگر آپ کو اپنے گاہکوں کی اعلیٰ درجے کی خدمت کرنی پڑتی ہے اور بیمے کے تمام رموز سے پوری واقفیت بھی رکھنی پڑتی ہے۔ اور آپ کو اپنے گاہک اداروں کی انتظامیہ کے اعلیٰ افسروں سے اچھے تعلقات بھی رکھنے پڑتے ہیں۔ کلیمز کے معاملے میں یہ رشتے بہت اہم ہو جاتے ہیں۔ کمپنی کے سربراہوں سے رابطے میں رہنا سب سے اہم ہوتا ہے۔ میں آنکھیں بند کر کے ہی گاہک کی تلاش میں نہیں نکل جاتا۔ میں انھیں لوگوں کا کام لیتا ہوں جن سے میں ایک طرح سے نبھا سکتا ہوں اور ایسے لوگوں کو میں ویسی ہی خدمات فراہم کرتا ہوں جیسی کہ ان کو درکار ہوتی ہیں۔"

کامیاب اور اعلیٰ درجے کے سیلز مین کی طرح ابول بھائی کو بھی مناسب مقدار میں حوصلہ افزائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ انھوں نے

ہمیشہ کمپنی کے چلانے والے سے براہِ راست سلسلہ رکھنے کا خیال رکھا ہے۔ اپنے افسروں کی ناراضگی کے باوجود انھوں نے حیدر صاحب، مسٹر بھیم جی اور مسٹر سیف الدین زومکا والا سے بھی اپنے رشتے استوار کر رکھے ہیں جن کا وہ دل کی گہرائیوں سے احترام بھی کرتے ہیں اور ان کی صلاحیتیوں کے معترف بھی ہیں۔

ابول بھائی نے بتایا کہ ''جب میں نے جز وقتی ایجنٹ کی حیثیت سے ای ایف یو میں شرکت اختیار کی تو میں نے حیدر صاحب سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ میں اسی وقت کامیابی سے کام کر سکتا ہوں جب تک میں ان سے براہ راست سلسلہ رکھ سکتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ مسٹر ریاست اللہ کو، جو اس وقت لائف ڈپارٹمنٹ کے چیف تھے، یہ بات پسند نہ تھی۔ مگر میں اسی طرح کام کرتا رہا۔ اور جب مسٹر بھیم جی آئے تو ان سے بھی میں نے یہی بات کہی تھی۔ وہ بہت فراخ دل اور زیرک انسان تھے، فوراً سمجھ گئے کہ میں ایسا سلسلہ کیوں چاہتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں ایک کے بعد دوسرا ریکارڈ قائم کرنے لگا۔ میں کمپنی کا پہلا آدمی تھا جس نے دس لاکھ روپے کی پالیسی فروخت کی تھی۔ ان دنوں اتنی بڑی رقم کی پالیسی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ دراصل میں نے ایک ہی خاندان کے افراد کو سترہ لاکھ روپے کی پالیسیاں فروخت کیں اور ان سے ملنے والے کمیشن سے میں نے مسٹر بھیم جی کے مکان کے قریب ہی اپنا پہلا مکان تعمیر کیا تھا۔ اور میرے گیراج میں دو مرسڈیز گاڑیاں ہوتی تھیں۔ اس زمانے میں پاکستان میں واحد ایجنٹ میں تھا جس کے پاس مرسڈیز گاڑی اور دوسرے متعلقہ لوازم ہوا کرتے تھے۔''

ابوالمحمود انشورنس کے پیشہ ور سیلز مین ہونے پر بجا طور پر فخر کرتے ہیں۔ اتنے برسوں اس کام کو انھوں نے اپنے انداز ہی میں کیا ہے۔ ان کے نزدیک یہ ایک دکان کی ملکیت کے مانند ہے جس میں اعلیٰ درجے کے نام کی مصنوعات فروخت ہوتی ہیں۔ اس ادارے میں رہ کر کام کرتے ہوئے بھی انھوں نے اپنا طریقۂ کار اپنایا۔ اپنے ہدف خود مقرر بھی کیے اور انھیں حاصل بھی کیا۔ انھیں کمپنی کے اندرونی معاملات سے، اس کی انتظامیہ سے، انتظامیہ کے مسائل سے کبھی کوئی سروکار نہیں رہا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ہمیشہ بہترین ادارے کی نمائندگی کرنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اعلیٰ درجے کے سیلز مین بنے اور اس میدان میں اپنا بھرم قائم رکھا۔ مگر انھوں نے خود کو ادارے کی مشین کا حصہ نہیں سمجھا۔ وہ ای ایف یو گروپ کے موجودہ چیف کے اس لیے معترف ہیں کہ ''انھوں نے اس ادارے کو بڑی مشکلات کے نرغے سے نکال کر مقبولِ عام بنا دیا ہے۔ لوگ اب صحیح معنوں میں مسٹر بھیم جی کے اس فیصلے کا ادراک کر سکتے ہیں کہ انھوں نے ان کو اپنا جانشین کیوں بنایا تھا۔ پاکستان میں یہ عام رواج ہے کہ لوگ ہمیشہ صرف اپنا ہی فائدہ کرنا چاہتے ہیں۔ مگر یہ بہت مختلف انسان ہیں۔ انھوں نے اپنے ڈیولپمنٹ افسروں کی آمدنی کے اپنی آمدنی سے زیادہ ہونے پر کبھی رشک نہیں کیا۔ نہ اس پر کہ وہ ان کے گاڑی سے بڑی اور قیمتی گاڑی استعمال کرتے ہیں۔ انھوں نے اس ادارے کی بہبود کے لیے بڑے کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں اور اگر چہ ان کے کئی ماتحت عرصۂ ملازمت کے اعتبار سے ان سے پرانے ہیں مگر یہ ان کے دل جیت چکے ہیں اور ان کے ذہنوں پر ان کا راج ہے۔ ایک عظیم لیڈر کا انتخاب کتنا اچھا تھا۔''

ابول بھائی نے ایک بار مجھ سے کہا تھا کہ ان کے پاس ای ایف یو کی انتظامیہ کے اعلیٰ افسران کی شخصیات اور اس کی تنظیم کے بارے میں سوچنے کے لیے فاضل وقت نہیں ہوتا۔ وہ بہت کم لوگوں سے واقف ہیں سوائے ان کے جن سے ان کی دوستیاں ہیں۔ نہ ہی وہ کسی سے قربت کے طلب گار رہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ''میں اپنی دکان کھولتا ہوں، مصنوعات فروخت کرتا ہوں، اپنے گاہکوں تک پہنچاتا ہوں، دکان بند کرتا ہوں اور اپنے گھر چلا جاتا ہوں۔'' ان کے اس پیغام میں پوشیدہ رازوں تک پہنچنے میں مجھے کافی وقت لگا ہے۔ مگر میں بالآخر ان کی تہ تک پہنچ گیا ہوں۔ ممتاز درجے کے پیشہ ور سیلز مین ایک طرح سے بھیڑیوں کے مانند ہوتے ہیں۔ یا تو وہ بھیڑیوں کے کسی غول کی سربراہی کرتے ہیں یا پھر، بھوکے اور تنہا بھیڑیے کی طرح ہمیشہ اپنے شکار کی تلاش میں رہتے ہیں۔ وہ کسی غول کے صرف ایک معمولی رُکن بننے میں قباحت محسوس کرتے ہیں۔ بس یہی بات انھیں دوسرے سے ممتاز کرتی ہے اور انھیں اعلیٰ سے اعلیٰ ہدف حاصل کرنے میں مدد دیتی

ہے۔ میرے خیال میں ابوالمحمود اسی اعلیٰ نسل کے سیلز مین افراد کی بہترین مثال ہیں۔ وہ جو کچھ ہیں اسی پر انھیں فخر ہے اور ایسا فخر بلا جواز نہیں۔ وہ اس قدیم اور قابلِ احترام ادارے کا، جس کا وہ خود بھی اہم حصہ ہیں، پرچم لہرانے میں بھی فخر محسوس کرتے ہیں۔ وہ اس بات پر بھی فخر کرتے ہیں کہ وہ خود اپنے مالک ہیں، آزاد ہیں۔ اپنے ادارے کی کامیابیوں میں ان کا بڑا حصہ ہے۔ قبل اس کے کہ میں انھیں اسی راستے سے رخصت کرنے کے لیے، جس سے بلا کسی روک ٹوک کے وہ مسٹر بھیم جی اور مسٹر حیدر سے ملنے آجایا کرتے تھے، اپنے کمرے سے باہر آتا، انھوں نے کہا، ''ای ایف یو میری کمپنی ہے۔ اس میں اِدھر اُدھر سے بہت سے داغ لگ چکے ہیں، اس کے باوجود اس کے لیے کام کرنے میں مجھے بہت لطف آتا ہے۔ جس رفتار سے یہ ترقی کر رہی ہے، اس کے امکانات بہت وسیع دکھائی دیتے ہیں۔ مجھے کمپنی تبدیل کرنے کا کبھی خیال بھی نہیں آیا۔ مجھے اس ادارے میں رہنے پر فخر ہے۔ میں ہمیشہ سے ایسٹرن فیڈرل یونین میں ہی رہا ہوں۔''

میں انھیں رخصت کرنے جب نچلی منزل تک آیا اور بحیرۂ عرب سے آنے والی تیز ہوا کا سامنا ہوا تو میں نے دیکھا کہ ابوالمحمود کے سپید گھونگھریالے بال ان کے ہمیشہ کی طرح روشن، شفاف اور محنت کش چہرے پر بکھر گئے تھے۔ وہ ایک بار پھر میری طرف مڑے، انھوں نے اپنے مخصوص اور اب بھی پُرعزم انداز میں اپنا ہاتھ ہلایا اور میں ایک بے کنار ماضی کی زندہ روایت کو جاتے ہوئے دیکھتا رہ گیا۔

ایس اے رشید

آپ کا مخلص

دنیا کا ادب سورماؤں اور صوفیا کے ایک سے ایک شان دار تذکروں سے بھرا پڑا ہے۔ اس میں کوئی حرج بھی نہیں۔ قاری خود کو ڈھالنے کے لیے ہمیشہ انسان کی کامیابی کی شان دار داستانوں کے سانچوں کی تلاش میں رہتا ہے۔ بہت کم ایسا ہوا ہے کہ تاریخ کے صفحات میں ایسے لوگوں کا ذکر ہوا ہو جو اپنی تمام زندگی خاموشی سے اُن لوگوں کی خدمت میں مشغول رہتے ہیں جو شہرت کی بلندیوں پر ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ کم کم نظر آتے ہیں اس لیے کہ وہ پسِ پردہ طاقت کے سرچشموں سے پُر ایوانوں میں رہ کر خدمات انجام دیتے رہتے ہیں۔ ان لوگوں کی حیثیت گلدانوں میں سجے ہوئے پھولوں جیسی ہوتی ہے جن سے ماحول کو خوش نما اور خوش بو سے معمور رکھنے کی توقع کی جاتی ہے۔ اور اگر کبھی ان کا تذکرہ ہو بھی جائے تو وہ فکاہیہ انداز کے ڈراموں کے معصوم اور ذرا کم عقل اور قدرے مسخرے کارندوں کی طرح ہوتا ہے جو خفیہ اور شبہات سے پُر پیغام رسانی کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ کچھ Leporello کی طرح خوش قسمت بھی ہوتے ہیں جو شہرت کی بلندیوں تک اس لیے پہنچ گیا تھا کہ موتسارٹ نے اس کو Don Giovanni کا قابلِ اعتماد ساتھی بننے کا اس وقت تک موقع دیا جب تک کہ اس کا آقا خود جہنم رسید نہیں ہو گیا تھا۔ یا ''سروانتے'' کے لازوال انسانی کردار سانچو پانزا کی طرح جو Don Quijote de la Mancha کا حاشیہ بردار اور سفر و حضر میں اس کا ایسا ساتھی بنا رہا تھا جس کی وفاداری کی نظیر نہیں ملتی۔

اصلی گوشت و پوست کے بھی ایسے لوگ ملتے ہیں اگر چہ ان کے کردار مختلف اقسام کے ہوتے ہیں۔ ان میں سے کئی بذاتِ خود عظیم بھی ہوتے ہیں اگر چہ ان کی موجودگی کبھی کبھی دنیا والوں، اور بالخصوص ان کے ہم عصروں کی نظروں سے اوجھل رہ جاتی ہے۔

میں اب جس شخصیت کا تذکرہ کرنا چاہ رہا ہوں اُس کو اِس زمرے میں نہیں رکھا جا سکتا جس کا تذکرہ مندرجہ بالا سطور میں کیا گیا ہے مگر اس میں کچھ ایسی خصوصیات ہیں جن کی وجہ سے اس کو نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا۔ وہ شخصیت رشید صاحب کی ہے جو زندگی بھر مرحوم روشن علی بھیم جی کے ذاتی معاون رہے ہیں، اور آج بھی ان کے ادارے کے ایک چھوٹے سے بے آرام کمرے میں بیٹھے نظر آتے ہیں جس میں ادارے سے باہر کی دنیا کو دیکھنے کے لیے اب بھی کوئی چھوٹا سا دریچہ نہیں۔ اس کے باوجود وہ اپنے محبوب افسر سے کسی درجہ کم نہیں جس نے ان کو ادارے سے باہر کے آسمان پر، آفتاب پر یا بادلوں پر بھی نظر ڈالنے کا موقع نہیں دیا۔

رشید صاحب اپنے افسر اور ہیرو کی حیرت انگیز، طوفانی اور مبہم جو شخصیت پر بے شمار صفحات کے لیے مواد مہیا کر سکتے ہیں اور ان لوگوں کے بارے میں بھی جو کبھی بھی ان کے افسر سے قریب رہے ہیں۔

رشید صاحب یو پی کے شہر علی گڑھ میں اکتوبر ۱۹۳۰ء میں ایک سرکاری ملازم کے گھر پیدا ہوئے اور ۱۹۴۹ء میں انھوں نے پاکستان ہجرت کی۔ ان کے والد ریلوے میل سروس میں ملازم تھے اور انھوں نے ۱۹۴۷ء میں پاکستان تبادلے کا فیصلہ کیا تھا۔ اپنی ابتدائی تعلیم کی تکمیل

کی خاطر رشید صاحب اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ دو برس تک ہندوستان میں مقیم رہنے کے بعد لاہور میں اپنے والد سے آملے تھے۔ اپنے والد کی مالی معاونت کے لیے رشید صاحب نے پاکستان کی سب سے پرانی بیمہ کمپنی مسلم انشورنس میں ملازمت اختیار کر لی جس کا صدر دفتر لاہور ہی میں تھا۔ ۱۹۵۳ء میں ان کا خاندان لاہور سے کراچی منتقل ہو گیا جو اس زمانے میں پاکستان کا دارالحکومت تھا۔ کراچی منتقل ہونے کے بعد رشید صاحب کو ایسٹرن فیڈرل یونین کے لائف ڈپارٹمنٹ میں ملازمت مل گئی۔ یہ وہی زمانہ تھا جب ان کے خاندان کے دوست اور اس وقت کے کنٹرولر آف انشورنس مسٹر بشیر احمد رفیق کے ذریعے ان کا تعارف مسٹر بھیم جی سے ہوا جو ان دنوں کئی ایک ذمے داریوں کا بوجھ اپنے کاندھوں پر لادے ہوئے تھے۔ مسٹر بھیم جی بمبئی لائف کے منیجر تھے، کینیڈا کی کمپنی ویسٹرن انشورنس کے منیجر تھے اور ساتھ ہی ہندوستان کی بڑی انشورنس کمپنی نیو انڈیا انشورنس کے پاکستان میں منتظم بھی تھے۔ ان کے علاوہ وہ پاک انڈر رائٹرز کے نام سے ایک چیف ایجنسی بھی چلا رہے تھے۔ مسٹر بھیم جی کو ایک قابلِ اعتماد ذاتی معاون کی ضرورت تھی اور انھوں نے اس کام کے لیے رشید صاحب کا انتخاب کیا۔

بھیم جی سے اپنے زندگی بھر کے ساتھ کی جڑوں کی تلاش میں اپنے حافظے پر زور دیتے ہوئے رشید صاحب نے کہا، ''میں ان سے ملا اور ان کے انداز اور مہربان رویے سے بہت متاثر ہوا۔ میں فوراً اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ مجھے ان کے ساتھ کام کرنے میں لطف آئے گا۔ میں ایسٹرن فیڈرل میں ملازمت اختیار کر چکا تھا مگر میں نے ایک لمحہ بھی تامل کیے بغیر ان کے ادارے میں کام کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ انھوں نے مجھے اپنا ذاتی معاون مقرر کیا اور زندگی کے بیمے کے اپنے کاروبار کا مہتمم بھی بنا دیا۔ جب ہندوستان میں زندگی کے بیمے کی صنعت کو قومی ملکیت میں لے لیا گیا تو بھیم جی صاحب نے میری خدمات اپنے دوسرے اداروں فیبر ٹریڈ، پاک پن انڈسٹریز اور میٹل پروسسنگ انڈسٹریز کے سپرد کر دیں۔ جب وہ لائف انشورنس کارپوریشن آف انڈیا کے لائیزن افسر کے طور پر کام کر رہے تھے تو اس کی ذمے داری بھی میرے سپرد کر دی تھی مگر اپنے ذاتی معاون کی حیثیت میں۔ بعد میں جرمنی کے ادارے Triumph International سے اشتراک میں بھی کاروبار شروع ہوا جو آج بھی بھیم جی خاندان کا بڑا صنعتی ادارہ ہے۔ جب ۱۹۵۳ء میں دو برس کی ملازمت کے بعد میں ای ایف یو چھوڑ کر بھیم جی صاحب کے ادارے میں شامل ہوا تھا اس وقت تک مجھے اس بات کا گمان بھی نہیں تھا کہ ایک دن مجھے اسی ادارے میں واپس آنا ہوگا، مگر اس بار مختلف حیثیت میں۔ بہر حال جیسا کہ آپ جانتے ہیں بھیم جی صاحب نے چیف ایگزیکٹیو کی حیثیت سے ۱۹۶۱ء میں ای ایف یو میں شمولیت اختیار کی اور انھوں نے مجھ سے کہا کہ میں روزانہ آدھے دن کے لیے ان کے نئے دفتر میں عظیم صاحب کی مدد کروں جو حیدر صاحب کے ذاتی معاون تھے اور اب بھیم جی صاحب سے منسلک کر دیے گئے تھے۔ آپ کے جرمنی واپس جانے کے چند ماہ بعد ہی بھیم جی صاحب نے مجھے ای ایف یو میں بلا لیا اس لیے کہ وہ مجھے اپنے ذاتی کام سونپنا چاہتے تھے۔ میں خود کو روئے زمین کا سب سے خوش قسمت انسان سمجھتا ہوں اس لیے کہ مجھے روشن علی بھیم جی جیسا افسر ملا تھا۔ انھوں نے کبھی مجھے اپنا ماتحت نہیں سمجھا بلکہ اپنے خاندان کا ایک فرد تصور کیا تھا۔ مجھے ان کے ساتھ کام کرنے کا اعزاز نصیب ہوا اور میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ وہ ملک کے اندر اور باہر نہ جانے کتنے لوگوں کے لیے مہربان، شریف النفس دوست تھے۔ انھوں نے میرے اور میرے اہلِ خانہ کی بھی بہت مدد کی تھی۔ انھوں نے مجھے دوپہر کے بعد کالج جانے کی بھی اجازت دے دی تھی جہاں میں اپنی تعلیم شروع کر چکا تھا۔ اس طرح میں اسلامیہ کالج سے گریجویشن کرنے میں بھی کامیاب ہو گیا۔''

میں بھیم جی صاحب کے لیے رشید صاحب کی زبان سے نکلے ہوئے تعریفی کلمات سے صفحات کے صفحات بھر سکتا ہوں۔ میں ان کی، نقد اور غیر نقد، فیاضی اور انسان دوستی کے ضمن میں بیان کی ہوئی حیرت انگیز مثالوں سے ایک طویل فہرست بھی تیار کر سکتا ہوں جو میں نے رشید صاحب کی زبانی سنی ہیں۔ میں نے تو خود بھی ایسی داد و دہش دیکھی ہے اس لیے میں رشید صاحب کے بیان کی تصدیق بھی کر سکتا ہوں۔ میں نے بھیم جی صاحب کی سوانح حیات میں ان کی فیاضی کی صرف دو مثالیں پیش بھی کی ہیں جس میں ان سے طلب کرنے والے لوگوں کے ساتھ ان کے فیضانہ رویے کی تفصیل دی گئی ہے۔ اور جو کچھ انہوں نے کیا اس کے عوض وہ کسی بات کی تمنا نہیں رکھتے تھے۔ جب رشید صاحب اپنی یاد

داشت کو کھنگال کر واقعات بیان کرتے ہیں تو ان کے انداز سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا چہرہ فخر کے احساس سے چمک اٹھتا ہے کہ وہ ان خیراتی کاموں میں بھی ان کے معاون رہے تھے۔ رشید کہتے ہیں کہ" وہ کبھی ان باتوں کی منصوبہ بندی نہیں کرتے تھے۔ ان کا ردِعمل اضطراری ہوا کرتا تھا۔ وہ مجھے سے کچھ کرنے کے لیے کہہ دیتے تھے اور میں حکم بجا لاتا تھا۔ خواہ اس میں ملک کے معزول صدور میں کسی ایک کے علاج کے لیے مالی معاونت ہو یا برما میں، یا دنیا میں کہیں اور بھی مقیم، ان طالب علم افراد کے لیے جن کی وہ امداد کیا کرتے تھے۔ کبھی کبھی تو یہ معمولی امداد ہوا کرتی تھیں جن میں زیادہ رقم درکار نہیں ہوتی تھی مگر ضرورت مند کے لیے بہت اہم ہوا کرتی تھی۔ مسٹر بھیم جی کو اس وقت بھی 'وزیر ساز' کہا جاتا تھا جب وہ ایسٹرن فیڈرل یونین میں شامل نہیں ہوئے تھے۔ وہ تقریباً تمام سربرآوردہ سیاست دانوں میں مقبول تھے اور پارلیمنٹ کے بیشتر ارکان سے ان کی دوستیاں تھیں۔ آپ محمد علی بوگرہ سے تو واقف ہیں جو پاکستان کے وزیرِ اعظم بنے تھے۔ مسٹر بھیم جی کی ان سے گہری دوستی بھی تھی اور وہ ان کے ذاتی مشیر بھی تھے۔ مثال کے طور پر مسٹر حبیب ابراہیم رحمت اللہ جو کبھی مغربی پاکستان کے گورنر تھے، جب وہ حکومت سے فارغ ہوئے تھے تو مسٹر بھیم جی نے انھیں عارضی پناہ کے لیے اور ینٹل بلڈنگ میں دفتر کے لیے ایک کمرہ فراہم کیا تھا اور مجھے حکم تھا کہ میں ان کے لیے بھی کچھ کام کروں۔ یہ ایک بہت چھوٹی سے مدد تھی مگر بہت اہم اور بروقت تھی، جب کی گئی تھی۔"

مسٹر بھیم جی کے دوستوں کے بارے میں رشید صاحب سے بات کرنا ایسا ہی ہے جیسے پاکستان کے پہلے پچیس برسوں کے عرصے پر محیط واقعات پر لکھی ہوئی کوئی کتاب کھول دی جائے۔ وہ نام گنواتے ہیں اور ان سے منسلک چھوٹی چھوٹی باتیں اس طرح بیان کرتے چلے جاتے ہیں کہ سننے والے کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ سب کچھ خود دیکھ رہا ہے۔ وہ ان تمام گورنر جنرلوں، صدور، وزرائے اعظم، وزیروں، سفیروں اور دوسری عزت مآب شخصیتوں کی وہ پرتیں کھولتے چلے جاتے ہیں جو عزت مآبی سے قبل عام سے انسان تھے۔ اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ وہ یہ سب اتنے سادہ طریقے سے بیان کرتے ہیں سننے والا محو ہو جاتا ہے۔

اگر چہ مسٹر رشید کئی برس قبل ریٹائر ہو چکے ہیں اس لیے کہ ان کی عمر اس حد سے آگے نکل گئی ہے مگر اب بھی وہ اپنی میز پر بیٹھے مسٹر بھیم جی کی وسیع مصروفیات، ان کے اہلِ خاندان اور ان کے دوستوں کے ٹیلی فون سے روابط کے انتظام میں مشغول رہتے ہیں۔ وہ اب بھی اپنے ہمہ جہت شخصیت رکھنے والے افسر کے معتبر معاون ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ مسٹر بھیم جی کی زندگی کا کوئی بھی گوشہ مسٹر رشید کی نظروں سے اوجھل نہیں۔ میں جو اُن سے اتنا قریب رہا ہوں، ان کے تمام منصوبوں سے اتنا آگاہ نہیں جتنے کہ رشید صاحب تھے۔ جس بات سے میں دم بخود رہ گیا ہوں وہ میرے دوست کی زندگی کے طویل عرصے میں ہونے والے واقعات سے رشید صاحب کا جذباتی لگاؤ تھا۔ رشید صاحب میرے دوست مسٹر بھیم جی کی دوست تقریباً تمام شخصیات سے ہر نوعیت کے تعلقات اور ان کی گہرائیوں سے اس طرح واقف ہیں کہ نہ صرف وہ ان کی طویل فہرست بنا سکتے ہیں بلکہ ہر ایک کا گہرا تجزیہ بھی پیش کر سکتے ہیں۔ مسٹر بھیم جی سے رشید صاحب کی بیالیس برس کی قربت ایک ذاتی مددگار سے کہیں زیادہ ہو کر ایک قریبی رشتے میں تبدیل ہو چکی ہے۔ رشید صاحب اپنے افسر کے نہ صرف سب سے بڑے محرم راز ہو گئے تھے بلکہ ان کو یہ اجازت بھی تھی کہ اگر ان کا ضمیر کہتا تھا تو وہ بلا تکلف کسی معاملے میں اپنی اختلافی رائے بھی دے دیتے تھے۔ مسٹر بھیم جی رشید صاحب کے خلوص اور ان کی ہنر مندی کے معترف تھے جس سے وہ ان کی اور ان کے خاندان کی خدمت کر رہے تھے۔ مجھے ایک خط کی نقل ملی ہے جو مسٹر بھیم جی نے ۱۹۶۸ء میں میونخ میں میرے دفتر سے رشید صاحب کو تحریر کیا تھا۔ یہ نقل اس لیے میرے پاس تھی کہ انھوں نے اس ضمن میں کچھ کام میرے سپرد بھی کیا تھا۔ اپنے خط میں انھوں نے لکھا تھا:

میرے پیارے رشید، میری غیر موجودگی میں آپ کو کچھ ذہنی سکون اور جسمانی آرام ملا ہوگا۔ مگر میرے لیے آپ کے بغیر زندگی مشکل ہوتی ہے۔ بانو کے علاوہ کوئی بھی میری حرکات سے نہ اتنا واقف ہے اور نہ ان کو برداشت کر سکتا ہے جتنا کہ آپ کرتے ہیں۔ اور میں اس کے لیے ہمیشہ آپ کا شکر گزار رہوں گا۔"

رشید صاحب کراچی میں خوش وخرم زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ان کے تین بیٹے اور تین بہت خوب صورت لڑکیاں ہیں۔ ای ایف یو کی روایت کے مطابق ان کے دو بیٹے اسی ادارے میں کام کرتے ہیں اور بہت کامیاب ہیں۔ وہ دونوں ادارے کے سب سے بڑے کاروبار کرنے والوں میں سے ہیں۔ یہ ان کے والد کے احترام کی وجہ سے ہے جو نہ صرف اس ادارے میں بلکہ پوری مارکٹ میں ان کو حاصل رہا ہے۔ تیسرا بیٹا امریکا کے شہر جارجیا میں مرسیڈیز کار کا ایک جدید گیرج چلا رہا ہے۔ تینوں بیٹیوں کی شادی ہو چکی ہے جو ان کے والدین کے طمینان میں اضافے کا باعث ہے۔ ایک عظیم انسان کے زندگی بھر کے معاون اور ساتھی ہونے کے باعث ان کی زندگی دل خوش کن یادوں سے معمور ہے۔ اور انھیں اپنی کامیابیوں پر بجا طور پر فخر کرنا چاہیے۔ مگر اس بات پر کوئی فخر نہیں کہ ان کے افسران پر اس وقت بھی اتنا اعتماد کرتے تھے جب اُنھیں ناکامیاں اور غم سہنے پڑتے تھے۔

زندگی بھر کے وفادار ساتھی اور محرمِ راز۔

محمود جعفری

غیر منجمد خفیہ خزانہ

جب روشن علی بھیم جی نے ۱۹۶۱ء میں ای ایف یو کی باگ ڈور سنبھالی تو انھیں نہ صرف لندن میں ہونے والے کمپنی کے نقصانات اور قرض خواہوں سے نمٹنا تھا بلکہ کمپنی کی سیلز فورس کے اعتماد کو بھی بحال کرنا تھا۔ سرمائے کی کمی اور مہم جویانہ دور بینی کے فقدان نے ایسی حیص بیص کی صورت پیدا کر دی تھی جو سرمائے کی کمی سے بھی زیادہ نقصان دہ ثابت ہو رہی تھی۔ بالکل اسی طرح جیسے کسی عارضے کے جراثیم جسم میں داخل ہو کر رفتہ رفتہ پورے جسم کو بے کار کر دیتے ہیں، یہ ادارہ بھی سر سے پاؤں تک فالج کا شکار ہوتا جا رہا تھا۔

دس برس کے عرصے تک ہر شخص سے یہی کہا جاتا رہا تھا کہ لندن میں ہونے والے نقصانات کی وجہ سے ادارے کے پاس اتنا سرمایہ نہیں رہ گیا ہے کہ کسی قسم کی سرمایہ کاری کی جا سکے جس سے مقررہ آمدنی کی ضمانت ہو۔ تعجب نہیں کہ اس قسم کی باتوں سے انتظامیہ اور کارکنوں کے درمیان کا ماحول آلودہ ہوتا جا رہا تھا جس کی وجہ سے کارکنوں کی یونین طاقت ور ہوتی جا رہی تھی۔ ان معنوں میں طاقت ور نہیں کہ یہ اپنے مالی مطالبات منوا سکے۔ جس انتظامیہ کی جیب خالی ہو ملازمین کے مشاہرے میں اضافے کے لیے اس پر دباؤ ڈالنے سے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔ ایسے حالات میں ایک طاقت ور ترین یونین بھی کچھ نہیں کر پاتی۔ مگر ایسے حالات میں ادارے کے رگ و پے میں ایک بد اعتمادی سرایت کرتی جا رہی تھی جس میں ہر ایک دوسرے کو اپنا ساتھی سمجھنے کے بجائے اپنا حریف سمجھنے لگا تھا۔ اور بلا شبہ اس سے کارکنوں کے حوصلے پست ہوتے جا رہے تھے۔ ادارے کے نظم و ضبط میں دراڑیں پڑ رہی تھیں اور مختلف درجے کے ملازمین کا آپس میں دست و گریباں ہونا روز مرہ کا معمول بن چکا تھا۔ اور اگر ایسی صورت میں انتظامیہ کسی کے خلاف کارروائی کرتی تو یونین درمیان میں آجاتی۔ یونین کو خوش رکھنے کے لیے عموماً انتظامیہ ہتھیار ڈال دیتی جس کی وجہ سے کارکنوں کے نظم و ضبط اور حوصلے ماند پڑتے جا رہے تھے۔

اس لیے مسٹر بھیم جی کو سب سے پہلے ان بدقسمت مسائل سے نبرد آزما ہونا پڑا تھا۔ انھیں نہ صرف یونین کے طویل معروضات کو ٹھنڈے دل سے سننا پڑا بلکہ ادارے کی تاریخ میں پہلی بار انھوں نے عہدے داروں کو احساسِ اہمیت دیا۔ بھیم جی صاحب نے صحیح معنوں میں ان لوگوں کو ادارے کا خفیہ خزانہ سمجھ کر اس کو مثبت انداز میں کمپنی کے مصرف میں لانے اور اس کی ترقی میں استعمال کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے یونین والوں کو اپنے ماضی کے بارے میں تفصیلات بتائیں، کس طرح خود انھوں نے رنگون میں دکان داروں کی ایک یونین بنائی تھی اور کس طرح بمبئی میں مشکلات میں پھنسے کارکنوں کے مسائل سلجھانے کی کوشش کی تھی۔ مسٹر بھیم جی یونین کے عہدے داروں کی اپنے ارکان کی بہتری کے لیے کوششیں جاری رکھنے کی حوصلہ افزائی کی مگر اس تاکید کے ساتھ کہ ادارے کی نئی انتظامیہ کی تجوریاں خالی ہیں اور وہ ناممکن کو ممکن نہیں بنا سکتی۔ مگر انھوں نے یونین کے عہدے داروں میں ادارے کے مستقبل کے بارے میں اعتماد کی فضا بحال کرنے کی کوشش کی اور انھیں صحیح معنوں میں ادارے کا ساجھے دار بن جانے کی پیش کش کی۔ سب سے کم تنخواہ پانے والے ملازمین کی تنخواہوں میں فی الفور اضافے کر

دیے گئے۔ اس طرح اعتماد کی ایک نئی فضا وجود میں آ گئی اور یونین کے عہدے داروں کو اس بات کا آسرا ہو گیا کہ حالات کی بہتری کے بعد ان کے مطالبات پر ہمدردی سے غور کیا جائے گا۔

ای ایف یو کے کارکنوں کی یونین کے عہدے داروں میں سے ایک محمود جعفری تھے جو ہیڈ آفس کے جنرل ڈپارٹمنٹ میں جونیئر کلرک تھے اور اس زمانے میں اس کی سربراہی میرے ذمے تھی۔ مجھے یونین سے منسلک مسائل کا کوئی تجربہ نہیں تھا اس لیے کہ جرمنی میں کسی ادارے کے لیے مخصوص یونینوں کا رواج نہیں تھا۔ وہاں صنعتوں کی یونینیں ہوتی تھیں۔ مگر میرے پیش رَو مسٹر شوارز یونین کے پیدا کردہ مسائل کی نوعیت سے مجھے پہلے ہی آگاہ کر چکے تھے جو بنیادی طور پر ادارے کی مالی کم زوری کی وجہ سے بگڑتے جا رہے تھے۔ مگر صرف سرمائے کی کمی ہی کی وجہ سے انتظامیہ اور کارکنوں کے درمیان فضا خراب نہیں ہو رہی تھی۔ کارکنوں کو اعتراض تھا کہ انتظامیہ ان کے مسائل سے آنکھیں چراتی ہے، اور اس بات پر اور بھی تلخی تھی کہ ان لوگوں کو ادارے کے دگرگوں حالات سے باخبر نہیں رکھا جاتا۔ ادارے کے کارکنوں اور یونین کے عہدے دار مسٹر شوارز کو ذاتی طور پر پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے اس لیے کہ جہاں تک ممکن ہوتا وہ ان کی مدد کرتے تھے۔ ان کے ماتحت کارکنوں میں محمود جعفری بھی تھے جن سے ان کا اکثر ٹکراؤ رہتا تھا مگر مسٹر شوارز سے ان کے ساتھیوں کی بھلائی کے لیے اقدامات کرنے کی کوشش کی بنا پر ان سے اچھے تعلقات بھی تھے۔

اپنے دورِ ملازمت کے دوران میں نے اس روایت کو قائم رکھنے کی کوشش کی تھی۔ مگر کمپنی کے ملازمین کی یونین سے میرے بھی تنازعات چلتے رہتے تھے ان میں سے ایک محمود جعفری تھے۔ وہ اتنے معمولی درجے کے کلرک تھے کہ میں ان کے نام سے بھی واقف نہ ہوتا اگر وہ یونین کے نمائندے نہ ہوتے۔ وہ ہر معاملہ بڑے زور شور سے پیش کرتے اور ایک دو بار تو وہ غصے سے بے قابو بھی ہوا چاہتے تھے۔ اس کے باوجود، جس انداز میں وہ ای ایف یو میں کام کرنے والے اپنے غریب ساتھیوں کے لیے جد و جہد کرتے تھے، میں انھیں پسند کرنے لگا تھا۔ وہ نچلے طبقے کے ملازمین کی نمائندگی کرتے تھے۔ نہ کہ ان لوگوں کی جو اپنا پیشہ ور مستقبل خود بنانے اور کامیابیوں کی سیڑھیاں چڑھنے کی کوشش کرتے تھے۔ میرے اور جعفری کے درمیان ایک اچھا کاروباری رشتہ قائم ہو گیا تھا۔ جب میں چھ برس تک اس ادارے میں کام کرنے کے بعد واپس جرمنی جا رہا تھا تو اسی رشتے کے ناتے جعفری نے مجھے ایک چھوٹا سا تحفہ بھی پیش کیا تھا۔

جب میں اس کتاب کے لکھنے کے سلسلے میں منصوبہ بندی کر رہا تھا کہ اس میں شمولیت کے لیے کن کن افراد کے خاکے لکھے جانے چاہییں تو ظاہر ہے کہ قدرتی طور پر زیادہ تر انھی لوگوں کے نام سامنے آئے جو یا تو اس ادارے کے مؤسسین میں سے اعلیٰ عہدے دار رہ چکے تھے۔ مگر میں ایسی شخصیتوں کی تلاش میں تھا جن کے نام قدرتی طور خود بخود سامنے نہ آتے ہوں اس لیے کہ اس طرح مجھے سیکڑوں کی تعداد میں وفادار ملازمین کے بارے میں لکھنا پڑتا اور یہ کتاب کبھی ختم ہی نہ ہوتی۔ اس تناظر میں جعفری کا نام ان لوگوں میں شامل ہو گیا میں جس سے باتیں کرنا اور ای ایف یو کے تناظر میں ان کے تذکرے اس کتاب میں شامل کرنا چاہتا تھا۔

آج پورے پینتیس برس بعد میں قمر ہاؤس کی پہلی منزل پر اس کمرے میں بیٹھا جعفری سے باتیں کر رہا تھا جو مجھے کمپنی کا ڈائریکٹر بننے کے بعد دیا گیا تھا، جس کے بالکل متصل کسی زمانے میں میرا دفتر ہوا کرتا تھا اور جہاں کسی معاملے میں پہلی بار میرا اور جعفری کا آمنا سامنا ہوا تھا اور جہاں جرمنی واپس ہوتے وقت جعفری نے مجھے چھوٹا سا مگر خوب صورت الوداعی تحفہ پیش کیا تھا۔ اس زمانے میں جعفری میرین ڈپارٹمنٹ میں کام کرتے تھے اور میں کمپنی کا تکنیکی سربراہ تھا۔ یہ کمرہ چیئرمین کے دفتر سے متصل ہے جس میں، اپنی صحت کی خرابی کے باعث مسٹر بھیم جی ہفتے میں صرف ایک بار، اور وہ بھی صرف دو گھنٹوں کے لیے بیٹھتے تھے۔

میری طرح محمود جعفری بھی بوڑھے ہو چکے تھے مگر ان کی آنکھوں کی چمک اسی طرح باقی تھی۔ وہ اب یونین میں نہیں رہے تھے مگر کمپنی کے ایک اعلیٰ عہدے تک پہنچ گئے تھے اور انھیں اس پر فخر تھا، فخر اس لیے اور بھی کہ اس ادارے سے ان کا زندگی بھر کا ساتھ رہا تھا جسے

گفتگو کے دوران کئی بار انھوں نے اپنا خاندان کہا تھا۔ میں نے ان سے اس وقت کے ان کے جذبات کے بارے میں دریافت کیا جب مسٹر بھیم جی کمپنی کے سربراہ کی صورت میں ادارے میں شامل ہوئے تھے تو انھوں نے کہا کہ میں بیان نہیں کر سکتا کہ ہم لوگ، یعنی میں اور یونین کی انتظامیہ، اس خبر کو سن کر کتنا خوش ہوئے تھے جب ہمیں اس بات کا احساس ہوا کہ کمپنی کے نئے سربراہ کے دل میں یونین کے نمائندوں اور اس کے ممبران کے لیے ہمدردی کے جذبات تھے۔

میں نے جعفری سے ان کے خاندانی پس منظر اور ای ایف یو کے ابتدائی دنوں کے بارے میں دریافت کیا۔ انھوں نے بتایا کہ وہ آگرے میں، جواب ہندوستان کا حصہ ہے، ۱۹۳۵ء میں پیدا ہوئے تھے اور ان کے خاندان نے ۱۹۴۹ء میں پاکستان ہجرت کی تھی۔ ان کے والد سرکاری ملازم تھے اور سرکاری جائیداد کے محکمے میں متعین سٹی مجسٹریٹ کے دفتر میں کام کرتے تھے۔ ان کی اعلیٰ تعلیم کراچی کے ماڈرن اسکول سے شروع ہوئی جہاں سے انھوں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا تھا۔ بعد میں انھوں نے جز وقتی تعلیم اختیار کی اور گریجویشن کیا تھا۔ اس کے بعد انھوں نے ایسٹرن فیڈرل یونین میں ٹائپسٹ کی حیثیت سے ملازمت کر لی تھی۔ انھی دنوں مسٹر کے ایف حیدر جنرل منیجر بن کے آئے تھے اور مسٹر ایون ان کے نائب تھے۔ جعفری سے بات کرنا ایسا تھا "گویا دبستان کھل گیا"۔ پرانے وقتوں کے نام جو میرے حافظے میں دفن ہو گئے تھے اُن کی زبانی ایک ایک کر کے یاد آنے لگے۔ مہتاب احمد صدیقی، فائر ڈیپارٹمنٹ کے سپرنٹنڈنٹ، ان کے نائب مسٹر رضوی، میرین ڈیپارٹمنٹ کے سخت مگر منکسر اور نہایت ذمے دار سربراہ اے جی خان، ری انشورنس کے مسٹر رسل، میرین کے انڈر رائٹر دراز قد اور دبلے پتلے حیدر صاحب وغیرہ۔ ان کے بہت سے ساتھی مر کھپ چکے ہیں یا ریٹائر ہو گئے ہیں۔ بہ لحاظِ عمر جعفری صاحب بھی ریٹائر ہو جاتے مگر انھیں موٹر کلیمز ڈپارٹمنٹ میں سینئر وائس پریزیڈنٹ کے عہدے پر روک لیا گیا تھا۔ چوری ہو جانے والی گاڑیوں کے کلیم میں ان کا طویل تجربہ کمپنی کے لیے قابلِ قدر تھا اور اب بھی ہے۔ کمپنی کی روایت کے مطابق کمپنی کے ملازمین کی دوسری اور تیسری نسل بھی کام کمپنی میں کر رہی ہے، جعفری کے دو بیٹے بھی کمپنی میں ملازم ہیں۔

مسٹر جعفری آج بھی اپنے جرمن افسر مسٹر شوارز کی تعریف کرتے ہیں۔ مسٹر حیدر کے بارے میں بھی جن سے کمپنی کی یونین کے معاملے پر جھڑپیں چلتی رہتی تھیں، وہ کہتے ہیں، "وہ بھی بہت رحم دل انسان تھے۔ اگر چہ وہ بہت سخت گیر انسان تھے مگر انھوں نے کمپنی کے مشکل ترین حالات میں بھی کسی کو کمپنی کی ملازمت سے برخاست نہیں کیا۔ اور اگر کوئی بھی ان کے دفتر میں آتا اور یہ کہتا کہ وہ مفلس ہے اور کوئی ذریعۂ معاش نہیں تو حیدر صاحب کہتے کہ چلو بیٹھ جاؤ، کام شروع کر دو، تمھیں سو روپے ماہانہ تنخواہ مل جایا کرے گی۔ مگر اپنے پس منظر کے پیشِ نظر وہ یونین کے مخالف تھے اور اس کو پسند نہیں کرتے تھے۔ انھیں اپنی میز پر ہمارے خطوط بالکل پسند نہیں تھے۔ اور جب کبھی ہم انھیں کوئی خط لکھتے تو وہ ہمیں بلا کر وہ خط ہمارے منھ پر مار دیتے تھے۔ ہمیں ان کے خلاف مہم چلانی پڑی تھی، ہم نے ہڑتال بھی کی تھی۔ میں ذاتی طور پر اس قسم کی کارروائیاں پسند نہیں کرتا تھا۔ یونین میں میری صدارت کے زمانے میں کوئی ہڑتال نہیں ہوئی تھی۔ میں یونین کا صدر، نائب صدر اور کمپنی کی مینجنگ کمیٹی اور ورکس کمیٹی کا رکن رہ چکا ہوں۔ ورکس کمیٹی کے چار ارکان ہوتے تھے جس کے چیئرمین ایس ایم معین الدین اور میں وائس چیئرمین تھا۔ اس میں ہم مسائل اور ملازمین کی بہبود پر بحث مباحثے کرتے تھے۔ اور میں نے یہ کام کئی برس کیا تھا۔ ایک دن میں نے یونین کی ذمے داریوں سے سبک دوش ہونے کا فیصلہ کر لیا اور ان تمام ذمے داریوں سے فراغت چاہی میں جن سے کئی برس تک الجھتا رہا تھا۔ مگر مسٹر بھیم جی اس بات پر اڑے رہے کہ مجھے اس وقت تک یونین کے کام کرنے چاہییں جب تک کہ وہ ادارے کے سربراہ کے عہدے سے فارغ نہیں ہو جاتے۔ میں راضی ہو گیا۔ جب وہ چیئرمین بن گئے تو میں نے ایک بار انھیں ان کی بات یاد دلائی تھی۔ حالاں کہ نئے سربراہ نواب حسن صاحب بھی یہی چاہتے تھے کہ میں یونین کا عہدہ اپنے پاس رکھوں مگر میں نے چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا، اس لیے کہ میں پیشہ ور یونین والا نہیں تھا اور میں اس بوجھ کو اپنے سر سے اُتار پھینکنا چاہتا تھا۔ میں ادارے کی اعلیٰ سطحوں تک پہنچنا چاہتا تھا۔ میرے چار بچے ہو چکے تھے اور مجھے ان کی

دیکھ بھال کرنی تھی۔ اس طرح میں نے کمپنی میں اپنی جگہ بنائی جس کو میں اپنے خاندان کی طرح سمجھتا تھا۔''

پھر ہم نے ۱۹۵۰ء اور ۱۹۶۰ء میں کمپنی کے ان مسائل پر باتیں کیں جو مسٹر بھیم جی اور مسٹر خلیلی سے قبل پیدا ہوئے تھے۔ میں اس مقام پر ان کے خیالات میں سے کچھ اقتباسات پیش کرنا چاہتا ہوں اس لیے کہ ان سے کمپنی کے ملازمین کے اس وقت کے خیالات کا اندازہ ہوتا ہے۔

''جی ہاں، اس وقت کمپنی کے مالی حالات بہت خراب تھے۔ اور عام لوگ بھی ای ایف یو کے کارکنان سے ناخوش تھے۔ ان کے کچھ اس قسم کے الفاظ ہوا کرتے تھے، 'تم لوگ کلکتے والی ایسٹرن فیڈرل میں کام کرتے ہو؟ اوہ میرے خدا! ہمیں تم لوگوں سے ہمدردی ہے' یہ روزانہ کا معمول تھا۔ مگر یہ سب کچھ ایک ڈرامائی انداز میں ایک دم تبدیل ہوگیا جب مسٹر بھیم جی نے ادارے میں شمولیت اختیار کی تھی۔ اس کے دو برس بعد میں کمپنی کے کسی کام سے وزارتِ خارجہ کے پریس آفس اسلام آباد میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس سیکشن کے انچارج نے مجھ سے پوچھا، 'جعفری، آپ کہاں کام کرتے ہیں؟ میں نے جواب میں کہا، ایسٹرن فیڈرل۔ وہ تقریباً چیخ کر حیرت اور توصیف سے بھری آواز میں بولا، 'اوہ ایسٹرن فیڈرل! ملک کی سب سے بڑی انشورنس کمپنی میں!' آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ سن کر مجھے کتنی مسرت ہوئی ہوگی۔ کیا تبدیلی آگئی تھی۔ چند برس قبل ہم لوگ 'کلکتے والا' تھے۔''

مسٹر جعفری کو اپنی چالیس برس کی ملازمت پر فخر ہے۔ وہ کہتے ہیں، ''میرے جسم کی رگوں کا خون ایسٹرن فیڈرل یونین کی ملکیت ہے۔ میں نے جب ایسٹرن فیڈل میں شمولیت اختیار کی تھی اس وقت میں کچھ بھی نہیں تھا، بس ایک نوجوان تھا جس کا کوئی مالیاتی پس منظر نہیں تھا۔ ای ایف یو نے مجھے سب کچھ دیا ہے اور میں اس ادارے کا بہت شکر گزار ہوں۔ جیسا کہ میں کہتا ہوں، ای ایف یو میرے خاندان کی طرح ہے اور ساتھ ہی ساتھ ان معنوں میں وہ انشورنس کی ماں ہے کہ دوسری تمام انشورنس کمپنیوں کو وہی لوگ چلا رہے ہیں جنھوں نے ابتدائی تربیت ایسٹرن فیڈرل سے حاصل کی تھی۔ وہی سب اب پورے ملک میں پھیلے ہوئے ہیں۔''

میرے خیال میں ان کے الفاظ اپنے مطالب کی خود ترجمانی کرتے ہیں اور اسی وجہ سے میں انھیں اپنے قارئین تک پہنچانا چاہتا ہوں۔

مرزا فیض احمد

زمین سے آسمان تک

یہ ہیں مرزا فیض احمد جو ایک زمانے سے ہمارے اطراف گردش کر رہے ہیں۔ یہ ایسٹرن فیڈرل جیسے عظیم ادارے کی تاریخ کی زندہ مثال ہیں۔ کمپنی کے سب سے پرانے کارکنوں میں سے ایک اعلیٰ افسر ہیں، جو ڈپٹی ایگزیکٹیو ڈائریکٹر کے عہدے پر فائض ہیں اور ان کی ذمے داریوں میں انٹرنل آڈٹ، کریڈٹ اور بجٹنگ کنٹرول شامل ہیں۔ ان سے بات کرتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہم کسی انسانی انسائیکلو پیڈیا کی ورق گردانی کر رہے ہوں۔ یہ ان تمام لوگوں سے واقف ہیں جنھیں آئیون، حیدر، شوارز، اختر آزاد، وصال الدین، معین الدین، عظیم رحیم، سلطان احمد، میاں سعید احمد، امین خراسانی، نواب حسن، شرافت والا جاہی، ساجد زاہد جیسے ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس عظیم بنگالی سے بھی جس کو خدا بخش کہتے تھے جو ۱۹۶۰ء کے زمانے میں کمپنی کے لائف ڈپارٹمنٹ کا سربراہ تھا۔ مرزا فیض احمد خود بھی ایک زندہ لی جنڈ ہیں جو اس ادارے کی سب سے نیچی سطح سے ابھر کر اوپر تک پہنچے ہیں۔

مرزا فیض ۱۹۳۵ء میں دلّی میں مقیم ایک اوسط کاروباری خاندان میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد ایک چھوٹی سی بیڑی کی فیکٹری کے مالک تھے اور خام مال خریدنے کی غرض سے آسام جایا کرتے تھے۔ وہ ہوزری کی صنعت سے بھی وابستہ تھے۔ دوسرے عزیزوں کی طرح ان کے دادا کی بھی دلّی کے صدر بازار میں دکان تھی۔ جب تقسیم ہند کا اعلان ہوا تو ان کے والدین نے پاکستان ہجرت کرنے کا فیصلہ کیا، اس لیے کہ ان دنوں ہندوستان کے حالات بہت مخدوش ہو گئے تھے۔ مرزا فیض بتاتے ہیں کہ ان کے علاقے میں قتلِ عام ہو رہا تھا اور ان کے اہلِ خانہ کئی دن تک اپنے گھر میں محصور ہو کر رہ گئے تھے۔ ہندوؤں کے ہاتھوں ذبح کیے جانے کے خوف سے دلّی چھوڑنے کی غرض سے ان کا پورا خاندان ایک جگہ اکٹھا ہو گیا تھا۔ خوش قسمتی سے ان کے والد کے ایک دوست دلّی میں ڈپٹی کمشنر تھے اور ان کی وجہ سے انھیں راول پنڈی کے لیے ہوائی ٹکٹ دستیاب ہو گئے تھے جس کو انھوں نے اپنا گھر بنا لیا تھا۔

مرزا فیض احمد کو وہ لاشیں کبھی نہیں بھولتیں جو دلّی ایئر پورٹ جانے والی سڑک کے کنارے پڑی ہوئی تھیں۔ ''یہ ایک بہت بھیانک منظر تھا۔ بہت سی لاشیں بغیر سر کی تھیں۔ اور جب ہم لوگ دلّی ایئر پورٹ پہنچے تو ہمارے اطراف ہندو اور سکھ تھے جن کو دیکھ کر مجھ پر اور میرے چھوٹے بھائی بہنوں پر لرزہ طاری ہو گیا تھا۔ اس دن ہم بید مجنوں کی طرح کانپ رہے تھے خدا سے رحم کی دعائیں مانگ رہے تھے۔''

یہ لوگ خوش قسمت تھے کہ راولپنڈی پہنچ گئے تھے۔ مرزا فیض نے وہاں اسکول میں داخلہ لے لیا اور وہیں نویں جماعت تک تعلیم حاصل کی۔ ان کے والد نے راولپنڈی میں چھوٹا موٹا کاروبار کر لیا تھا۔ جب ان کے کچھ عزیز کراچی پہنچے تو ان لوگوں کو پتا چلا کہ کراچی کہیں بہتر مقام تھا اور وہاں کاروبار شروع کرنے کے لئے بہت سے مواقع تھے۔ اس طرح ان کے اہلِ خاندان نے کراچی منتقل ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ ۱۹۴۸ء کی بات تھی۔ مرزا فیض نویں درجے کی تعلیم مکمل کرنے کے لیے راول پنڈی ہی میں ٹھہر گئے تھے جہاں سے انھیں کراچی جانا

تھا۔ کراچی پہنچ کر انھوں نے میٹرک پاس کیا اور ایس ایم کالج میں آرٹس میں داخلہ لے لیا۔ ان کے والدان کے لیے اپنے اجداد کی طرح کاروبار کرنے کے خلاف تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ وہ کوئی پیشہ ور انسان بنیں اس لیے کہ اس وقت تک یعنی ۱۹۵۴ء میں وہ گریجویشن کر چکے تھے۔ اس وقت تک ان کے والد مختلف کاروبار کر چکے تھے۔ یہ شوق سے نہیں بلکہ مجبوری کی وجہ سے ہوا تھا۔ مرزا فیض بتاتے ہیں کہ ''میرے والد بہت ضعیف ہو چکے تھے۔ اور وہ کچھ پرانی وضع کے انسان بھی تھے۔ وہ اس زمانے کے لوگوں کی طرح جدید نہیں بن سکے تھے۔ میرے والد کے زمانے کے پرانے لوگوں کو یہی تربیت دی گئی تھی کہ وہ سیدھے سادے، ایمان دار اور کھرے انسان بنیں۔ میرے خیال میں شاید یہی وجہ تھی کہ وہ اس نئے ملک میں اپنے کسی کاروبار میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے۔ پاکستان میں انسان کو کامیابی کے لیے چلتا پرزہ بننا پڑتا تھا جوان کے لیے ممکن نہیں تھا۔ وہ اپنا گھربار کھو چکے تھے۔ ان کے پاس بس وہ قدریں ہی رہ گئی تھیں جو ان کو اپنے اسلاف سے ملی تھیں۔ در اصل وہ اپنی شناخت کھو چکے تھے۔ بہت قدامت پسند اور بہت زیادہ ایمان دار انسان تھے۔ میں گریجویشن کے بعد اپنے اہلِ خاندان کے ساتھ دو یا تین برس تک رہا تھا۔ میں نے کاروبار میں اپنے والد کی مدد کرنے کی کوشش کی تھی مگر اس میں کچھ زیادہ کامیابی نہیں ہو سکی۔ اس لیے ایک دن میں نے اپنے دور کے رشتے دار جناب معین قریشی سے رابطہ کیا جو ایک بڑی بیمہ کمپنی ایسٹرن فیڈرل انشورنس کمپنی کے ایکسیڈنٹ ڈپارٹمنٹ میں ملازم تھے۔ انھوں نے مجھے بھی ملازمت کا مشورہ دیا اور وعدہ کیا کہ وہ مجھے ملازمت دلوانے کی کوشش کریں گے۔ میں بہت خوش ہوا اس لیے کہ میرے والد کی صحت خراب ہو چکی تھی اور خاندان کی کفالت کے لیے مجھے ہی کچھ کرنا تھا۔ کالج کے دنوں میں ہی میں نے شارٹ ہینڈ اور ٹائپنگ سیکھنا شروع کر دیا تھا، ان دنوں جس کی بہت مانگ تھی۔ میں دن میں کالج جاتا، دوپہر کے بعد کاروبار میں اپنے والد کی مدد کرتا اور شام کو شارٹ ہینڈ اور ٹائپنگ سیکھتا تھا۔ ان دنوں اوسط درجے کے گھرانوں کے لیے زندگی واقعی بہت مشکل تھی۔ مگر ایک وسیع النظر خاندان سے ہونے کی وجہ سے بہادری سے ہم حالات سے نبرد آزما ہوئے، کبھی شکوہ نہیں کیا اور کبھی ہمت نہیں ہارے۔ ۱۹۵۹ء میں قریشی صاحب مجھے ملازمت دلوانے میں کامیاب ہو گئے اور میں نے ایسٹرن فیڈرل یونین کے کراچی ایجنسی سیکشن کے ایکسیڈنٹ ڈپارٹمنٹ میں کام شروع کر دیا جو اُن دنوں قمر ہاؤس میں تھا۔ مجھے Workmen Compensation Section میں تعینات کر دیا گیا۔ اس وقت تک کاروبار کلکتے ہی سے ہوتا تھا مگر ہم لوگ مقامی سطح پر دیکھ بھال کرتے اور خدمات فراہم کرتے تھے۔ کیوں کہ میں ایک کاروباری خاندان سے آیا تھا، میں نے بھی کچھ بزنس دینا شروع کر دیا۔ دفتر کے اوقات کے بعد میں مارکیٹ میں جاتا اور مجھے فخر تھا کہ میں اس کام میں کافی اچھا ثابت ہو رہا تھا۔''

مرزا فیض جس محکمے میں کام کر رہے تھے ۱۹۵۹ء سے ۱۹۶۵ء تک اس کے سربراہ ایس ایم معین الدین تھے۔ انھیں یاد ہے کہ ۱۹۶۵ء میں معین الدین صاحب نے ڈیویلپمنٹ کا کام کرنے اور پالیسیاں بیچنے کے عوض ان کی تنخواہ میں ایک سو روپے ماہوار کا اضافہ کرا دیا تھا اور سپرنٹنڈنٹ کے عہدے پر ان کی ترقی ہو گئی۔ یہ ان لوگوں کے لیے پہلا زینہ ہوتا تھا جو کمپنی میں افسر بننا چاہتے تھے۔ در اصل یہ کچھ ویسا ہی تھا جیسے کہ فوج میں افسر بننے سے پہلے سپاہیوں کو کارپورل اور سارجنٹ کے عہدے حاصل کرنے ہوتے ہیں۔ مرزا فیض اس کام میں ماہر نکلے اور رفتہ رفتہ ان کا کاروبار بڑھتا گیا۔ کمپنی نے ان کی کامیابی کے عوض ان کو ۱۹۷۱ء میں سینئر ڈیویلپمنٹ افسر، اس کے بعد اسسٹنٹ منیجر اور پھر ڈپٹی منیجر بنا دیا گیا۔

مرزا فیض نے بتایا کہ ''جناب سیف الدین زومکا والا نے، جن کے ساتھ میں پانچ چھ برس تک کام کر چکا تھا سائٹ برانچ کھولی تھی۔ اور جب وہ کریڈٹ اینڈ کامرس انشورنس گروپ میں شمولیت کے لیے دبئی چلے گئے تو یہ برانچ میرے حوالے کی گئی جسے میں نے بحسن و خوبی چلایا۔ یہیں سے بطور سیلز مین میری پیشہ ورانہ زندگی کی بڑے انداز میں ابتدا ہوئی تھی۔ میں اور میرے ساتھی تن من دھن سے جُٹ گئے اور ہم نے پانچ برس کے عرصے میں اس برانچ کے کاروبار کو آسمان پر پہنچا دیا۔ مجھے ایک برس میں دو ترقیاں ملیں۔ میں پہلے منیجر بنا، پھر وائس

پریزیڈنٹ اور اس کے بعد سینئر وائس پریزیڈنٹ بنا دیا گیا۔ اس کے بعد مجھے سدرن زونل آفس میں بھیج دیا گیا جہاں میں نے فصیح الدین صاحب کے ساتھ کام کیا۔ جب عظیم رحیم صاحب چلے گئے اور سلطان احمد صاحب آئے تو ۱۹۸۶ء میں مجھے سینئر ایگزیکٹیو وائس پریزیڈنٹ بنا دیا گیا۔ اور ابھی دس برس قبل، یعنی ۱۹۹۷ء میں مجھے ڈپٹی ایگزیکٹیو ڈائریکٹر کے عہدے پر ترقی دے دی گئی ہے۔ یہ تھی ای ایف یو میں میری رام کہانی۔ میں آج جو کچھ بھی ہوں ای ایف یو کے طفیل ہوں۔''

یہ سب کچھ کتنا آسان لگتا ہے مگر اس کی تفصیل کو سن کر یک گونہ خوشی محسوس ہوتی ہے۔ یہ کہانی ہے ایک ایسے انسان کی جس نے اپنی زندگی کا ایک حصہ ایک مالیاتی ادارے کی بہبود کے لیے وقف کر دیا تھا۔ اس نے جو کچھ کیا ایک مقصد سمجھ کر کیا جو کسی ادارے کے نفع اور نقصان سے کہیں بڑھ کر ہوتا ہے جس کے عوض اس کو بہت ساری ترقیاں بھی ملیں۔ اور جب ہماری گفتگو ختم ہوگئی تو میں سوچنے لگا کہ مرزا فیض نے جو کچھ کہا ہے وہی کچھ دوسرے لوگوں نے بھی بتایا تھا جب وہ اپنی زندگی کے تجربات بیان کر رہے تھے۔ مجھے اچانک یہ احساس ہوا کہ یہ ادارہ کسی عام قسم کے تجارتی ادارے سے کیوں مختلف تھا۔ شاید اس لیے کہ اس کے کچھ رہنماؤں نے خواب دیکھے تھے اور یہ انھی خوابوں کی تعبیر بن کر ہمارے سامنے موجود ہے، جو ادارے کی شمع کو لے کر چلے تھے اور انھوں نے اس کی کامیابی کو اپنی زندگی کا مشن بنا لیا تھا۔

۱۷ مئی ۱۹۹۷ء کو فیض مجھ سے کہہ رہے تھے ''پورے چالیس برس میں نے اس ادارے کی خدمت میں گزار دیے ہیں۔ اس عرصے میں بہت سے نئے ادارے قائم ہوئے اور مجھے بہت سے مواقع ملے مگر میں نے کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا اس لیے کہ اس ادارے کی ترقی میں اس کے سربراہ مسٹر روشن علی بھیم جی کے اندازِ کار نے مجھ میں اس کی خدمت کی امنگ پیدا کرتی تھی۔''

جو کچھ مرزا فیض کہہ رہے تھے وہ میرے لیے کوئی کچھ نئی بات نہیں تھی نہ اس شخصیت کی توصیف کے لیے پہلی بار کہی جا رہی تھی جو آج اس دنیا میں نہیں۔ مرزا فیض ان کاسہ لیس لوگوں کی طرح نہیں جو دنیا میں ہر طرف پائے جاتے ہیں جن کے بغیر یہ دنیا نامکمل نہیں۔ یہ بغیر چھل کپٹ کے ایک سیدھے سادے اور حق گو انسان ہیں اور انھوں نے وقتی فائدے پر کبھی نظر نہیں رکھی۔ انھوں نے ہمیشہ اپنے انداز سے دنیا کو برتا ہے۔ ان کے خاندان کے معیار نے انھیں بچپن سے سکھایا ہے کہ صبر اور شکر کے ساتھ اپنی باری کا انتظار کرو، جس پر انھیں فخر ہے۔

اس پر کسی کو حیرت نہیں ہوگی کہ مرزا فیض جیسے لوگ جو اپنی زندگی میں کامیابیوں سے ہمکنار رہے ہیں، عام دھارے کے انسانوں سے مختلف سوچ تو نہیں رکھتے تھے مگر وہ جو کچھ دیکھتے تھے، جن لوگوں سے ملتے تھے ان کا اپنے انفرادی انداز میں تجزیہ کرتے تھے، صَرف اپنے اعلیٰ افسروں کے انداز ہی میں نہیں۔

سب سے دل چسپ بات جو انھوں نے بتائی وہ یہ تھی کہ جب مسٹر بھیم جی سمندر پار بیمہ کمپنی بنانے میں مشغول تھے، لوگوں کا خیال تھا کہ وہ ملک کو خیر باد کہہ کر نہیں جائیں گے بلکہ آتے جاتے رہیں گے اور اس صنعت کو قومی ملکیت میں لیے جانے سے اس ادارے کو جو نقصان پہنچا ہے اس کے ازالے کے لیے وہ ای ایف یو جنرل کے مفادات کی نگرانی بھی کرتے رہیں گے۔

''مجھے یقین تھا کہ مسٹر بھیم جی اپنی مرضی سے ملک سے باہر نہیں جا رہے تھے۔ ان پر ضرور کسی قسم کا دباؤ ہوگا۔ ہم سب کو اس بات کا بہت افسوس تھا۔ اگر کوئی اس ملک میں کامیابی سے روزی کما رہا ہے تو اس کو لندن، سعودی عرب یا امریکا جانے کی بھلا کیا ضرورت ہوگی۔ جب میں اس کیفیت کو اپنے اوپر منطبق کر کے دیکھتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ جب میرا گھر ہے، میرے اعزّہ ہیں، اچھی ملازمت ہے تو مجھے ملک چھوڑ کر جانے کی کیا ضرورت ہوگی؟ ان کے اپنے لیے اچھا تھا یا بُرا تھا مگر ہمیں اس بات کا ضرور افسوس تھا کہ یہ ملک اتنے بڑے اور کامیاب کاروبار کے سربراہ کی خدمات سے محروم ہو رہا تھا۔''

مرزا فیض احمد ایس ایم معین الدین کو اپنے لیے مثالی کردار سمجھتے ہیں۔ ان کے الفاظ کے مطابق ''وہ بہت خوش باش انسان تھے۔ شاید انھوں نے انشورنس کا کام بھوپال سے شروع کیا تھا جب وہ حیدر صاحب سے ملے تھے، جو ریاست کے وزیرِ مالیات رہے تھے۔ اپنے بھائی کی

مدد سے جو نیشنل بینک آف پاکستان میں اعلیٰ افسر تھے، وہ بہت کامیاب ہوئے تھے۔ معین صاحب بہت چالاک، نہایت ذہین اور موقع شناس آدمی تھے۔ وہ بہت شگفتہ آدمی تھے، اتنے کہ مزاح ان کا ٹریڈ مارک بن گیا تھا۔ میں ان کی صلاحیتوں سے بہت متاثر ہوا تھا۔ جب ہم ایک ساتھ بیٹھتے تو وہ بیان کرتے کہ کس طرح اپنے گاہکوں کو انشورنس فروخت کرتے ہیں اور اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے وہ کیا کرتے ہیں۔ اور جب اپنے سینئر ساتھیوں کی مدد سے انھوں نے پاکستانی فوج کا انشورنس کرایا تھا، اف خدایا!، وہ تو ہم سب کے لیے ایک ہیرو بن گئے تھے۔ ایک انداز سے ان دنوں میں ان کی نقالی کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ میں بھی معین الدین کی طرح کامیاب آدمی بنوں گا۔ اس لیے کہ اگر چہ میں ہیڈ آفس کا ملازم تھا مگر میں نے بزنس کرنا بھی شروع کر دیا تھا۔ شام کا وقت فرصت کا ہوتا تھا اور میں نے اس کو استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا اور میں نے ویسا ہی کیا جس طرح معین الدین نے کیا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں ای ایف یو کا سب سے قسمت والا اور خوش وخرم آدمی ہوں۔ مجھے سب سے زیادہ ترقیاں نصیب ہوئیں۔ میں ایک معمولی ٹائپسٹ سے ایگزیکٹیو ڈائریکٹر کے عہدے تک پہنچا۔ ترقی کی سیڑھیاں چڑھ کر میں نچلی منزل سے اوپر تک گیا ہوں اور یہی کامیابی میرے لیے اطمینان اور خوشی کا باعث ہے۔''

جس وقت مرزا فیض مجھے اپنی کامیابیوں کی داستان سنا رہے تھے، کاش اس وقت اس کتاب کے قاری وہاں موجود ہوتے۔ انھیں اس بات پر فخر محسوس ہو رہا تھا کہ ان سے اس کمپنی میں ان کی زندگی اور کارکردگی کے بارے میں پوچھا جا رہا تھا جسے وہ اپنے خاندان کے بعد سب سے اہم سمجھتے تھے۔ آپ ان کی آنکھوں سے فخر چھلکتا محسوس کر سکتے تھے جب وہ منزل بہ منزل اپنی ترقی کی باتیں بتا رہے تھے۔ دراصل کبھی کبھی جذباتی اور خوف زدہ بھی ہو جاتے تھے مگر وہ یہ اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ ہمیشہ سیدھے راستے پر گامزن رہے ہیں۔ ان ہی جیسے لوگوں کی وجہ سے ادارے بڑے ہو کر اس مقام تک پہنچتے ہیں کہ دنیا کی نظروں میں آ جاتے ہیں۔ ایسے لوگ کسی بھی ادارے کی ریڑھ کی ہڈی ہوتے ہیں اور اس کو زرخیز مٹی فراہم کرتے ہیں جس کی مدد سے نئی کونپلیں پھوٹتی ہیں اور ترقی ہوتی ہے۔

محمد حسین علوی

شہابِ ثاقب

ہم دونوں کی بہت دنوں سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ تقریباً بیس برس قبل، ماربل آرچ اور کمبرلینڈ ہوٹل کے قریب بہت قریب، ہم روشن علی بھیم جی کی قیام گاہ ۲۵ر پورچیسٹر پلیس لندن میں ملے تھے۔ Raynham، جہاں مسٹر بھیم جی اس زمانے میں رہا کرتے تھے جب کریڈٹ اینڈ کامرس انشورنس قائم تھی۔ اس پتے سے بہت تھوڑے فاصلے پر واقع ہے، پورچیسٹر پلیس جواب بھی بھیم جی خاندان کی ملکیت ہے۔ ستمبر ۱۹۹۹ء کی ایک خوب صورت صبح ہماری ملاقات ہوئی تھی۔ ہمارے مشترکہ دوست ابا علی یوسف نے، جنھوں نے بھیم جی خاندان کے فلیٹ کی نگہداشت کی از خود ذمے داری لے رکھی ہے، از راہِ مہربانی ہمارے لیے بسکٹ اور کافی کا انتظام کر دیا تھا تا کہ ہماری گفتگو گھریلو ماحول میں ہو۔ علوی سے میری ملاقات ۱۹۶۰ء سے تھی جب ہم دونوں ایسٹرن فیڈرل یونین میں اکٹھے کام کرتے تھے۔ ایک بار ہم پھر اس وقت رابطے میں آئے جب کریڈٹ اینڈ کامرس انشورنس گروپ کی لندن میں بنیاد رکھی گئی تھی اور علوی لندن میں جنرل منیجر بن کر آئے تھے۔ علوی آج بھی ویسے ہی توانا اور چاق چوبند دکھائی دیتے ہیں۔ دراز قامت، چہرے پر کھیلتی ہوئی وہی مخصوص دبی دبی سی مسکراہٹ جو مجھے ہمیشہ سوچنے پر مجبور کر دیتی تھی۔ کسی طرف دیکھنا تو اس طرح کہ ان کی نگاہ ہدف چہرے کا طواف کرتی ہوئی آنکھوں سے چندانچ پرے ہی رہے تا کہ آنکھیں چار نہ ہو جائیں۔ علوی جب کمرے میں داخل ہوئے تو ان کی محبت بھری گرم نظر بالکل ویسی ہی تھی اور ویسا ہی، بلاتصنع بالکل فطری اندازِ تخاطب۔ علوی مجھے آج بھی ویسے ہی لگے جیسے کہ اس وقت جب ۱۹۶۲ء میں انھوں نے ایسٹرن فیڈرل یونین برانچ منیجر کی حیثیت سے راولپنڈی میں شمولیت اختیار کی تھی۔ مگر جب میں نے غور سے ان کے چہرے کا جائزہ لیا تو ان کی شان دار پیشہ ورانہ زندگی کے کچھ نئے اوراق بھی نظر پڑے جو ان کے جاذبِ نظر چہرے میں پیوست تھے۔ یہ وہی چہرہ تھا جس کو میں اپنے دوست مسٹر بھیم جی سے گفتگو کے دوران ای ایف یو کا شہابِ ثاقب کہا کرتا تھا۔

علوی مشرقی پنجاب کے اس حصے میں ۲۸ر دسمبر ۱۹۲۸ء کو پیدا ہوئے تھے جو تقسیم ہند کے بعد ہندوستان کا حصہ بن گیا تھا۔ ۱۹۴۷ء کی تقسیم کے وقت علوی نے آرٹ میں داخلہ لیا ہی تھا کہ ان کا خاندان ہجرت کر کے پاکستان کے شہر لاہور منتقل ہو گیا تھا۔ علوی نے بی اے لاہور سے پاس کیا۔ یہ ۱۹۵۰ء کا واقعہ ہے۔ علوی نے اس وقت تک اپنے مستقبل کے بارے میں کوئی خاص منصوبہ نہیں بنایا تھا اور پاکستانی پنجاب کے نہر کے محکمے میں ملازمت کر لی تھی۔ مگر انھیں فوراً ہی احساس ہو گیا تھا کہ وہ اس قسم کی منشی گیری کے لیے نہیں بنے تھے۔ اس لیے دو برس بعد یہ ملازمت انھوں نے چھوڑ دی تا کہ کچھ اور مختلف نوعیت کے کام کر سکیں۔ اور پھر انھوں نے امریکن لائف انشورنس میں ایجنٹ بننے کا فیصلہ کر لیا۔ اور لوگوں کی طرح یہ ان کے ایک قریبی دوست کا اثر تھا جس نے اس نئی کمپنی میں شمولیت اختیار کی تھی اور علوی کو اسی میں شمولیت کے لیے راضی کر لیا۔ علوی نے کہا، ”ہم ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے تھے۔ اور اس نے مجھے اس لیے بہت زور دے کر اس کام کو شروع